حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کی بعض اہم کتب

عید میلاد النبی کی شرعی حیثیت	صفحات: 64	قیمت: -/20
عورتوں کے امتیازی مسائل	صفحات: 320	قیمت: -/130
مروجہ قرآن خوانی اور ایصال ثواب	صفحات: 64	قیمت: -/18
اسلامی معاشرت	صفحات: 128	قیمت: -/60
کیا عورتوں کا طریقہ نماز مختلف ہے؟	صفحات: 64	قیمت: -/30

دارالعلوم دیوبند، جامعہ سلفیہ بنارس، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے نصاب پر مشتمل کتابیں اور ان کی شروحات کے علاوہ ہر قسم کی دینی اور علمی کتب بھی ہم سے طلب کریں۔

مکتبۃ الفہیم مئوناتھ بھنجن یوپی
Maktaba Al-Faheem
1st Floor Raihan MarketDhobia Imli Road
Sadar Chowk Maunath Bhanjan (U.P.) 275101
Ph: 0547-2222013 (S) 2520197 (R) Mob.9889123129/9236761926

’’اس شخص سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔‘‘ (قرآن)

سہ روزہ دعوت نئی دہلی

روزانہ سپر کمپیوٹر کے ذریعہ آنکھوں کی جانچ، پاور دھوپ کے فینسی چشمے اور کانٹکٹ لینس کے لئے

چشمہ گھر

مہاجنی ٹولہ (ڈاکخانہ روڈ) سرائے میر، اعظم گڑھ، (یوپی)
پن کوڈ 276305
★ جدید ڈیزائن اور ورائٹی ★ اعلیٰ کوالٹی
★ دوستانہ ماحول ★ بہتر سروس ★ برانڈ فریم

● جلد: ۵۷ ● شمارہ: ۱۰۶ ● ۱۶؍فروری ۲۰۰۹ء ● 16 Feb.2009 ● پیر ● ۲۰؍صفر المظفر ۱۴۳۰ھ ● قیمت= Rs.5/ ● سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک کیلئے ۲ ریال ● Posting: 14 Feb. 2009 Saturday

امریکہ، نئے صدارتی ۔۔۔ جائزہ ۔۔۔ انتخاب کے بعد

کھوئی ہوئی شناخت کا دوبارہ حصول آسان نہیں ہوگا

کلدیپ نیر، سینئر صحافی، نئی دہلی

جارج ڈبلیو بش نے جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس سے یہ لگ رہا تھا کہ ان کا نشانہ مسلم ممالک ہیں۔ دہشت گردی کے نام پر دنیا بھر میں مسلمانوں کو شکار بنا رہے تھے اور جیل کے نام پر ایک ایسا اذیت کیمپ کھول رکھا تھا جس میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو دہشت گردی کے نام پر ڈال رکھا تھا۔ بارک اوبامہ نے آتے ہی یہ اعلان کردیا کہ یہ کیمپ بند ہوجائے گا اور جن ممالک کے قیدی اس میں ہیں انہیں ان ملکوں کو دے دیا جائے گا تاکہ ان ملکوں میں ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ان کی مسلم دنیا سے کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ امریکہ کے تعلقات ماضی کی طرح بہتر ہوں گے۔ تیسری بڑی بات یہ کہ عراق جنگ سے ہاتھ اٹھانے کا بھی اعلان کردیا ہے۔ ان اعلانات سے اشارہ ملتا ہے کہ امریکہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اگر پالیسی میں عملاً کوئی تبدیلی شروع ہوگی تو ایک طرح سے انہیں اندرونی مخالفت کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ سب سے زیادہ ان کی مسلم تاریخ کے حوالے سے نشانہ بنایا جائے گا۔ ڈک چینی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اوبامہ امریکہ کی سلامتی کے لئے خطرہ ہیں۔ اس طرح کے بیانات مخالف حلقوں سے ابھی سے جاری ہیں۔ امریکہ کے ماضی میں اگر جائیں تو معلوم ہوگا کہ امریکہ ایک مہذب سیکولر جمہوری ملک رہا ہے۔ اس میں اس بات کو لے کر کوئی مذہبی امتیاز نہیں تھا۔ اوبامہ اسی کھوئی ہوئی شناخت کو دوبارہ واپس دلانا چاہتے ہیں تاکہ لوگ یہ کہہ سکیں کہ امریکہ ہی دنیا میں ایسا ملک ہے جہاں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ ایک چیلنج یہ ہے کہ جب وہ گوانتاناموبے کو بند کرنے کی بات کرتے ہیں تو دوسری طاقتیں ان کا سخت مقابلہ کریں گی۔ اقتصادی بحران پر قابو پانے کے لئے جو انھوں نے پیسوں کا مطالبہ کیا تو اس پر بھی ناخوشی کا اظہار کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں قدم قدم پر داخلی اور بیرونی مسائل کا سامنا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ عراق اور افغانستان میں جو لوگ لڑ رہے ہیں وہ اسے ملک کا دفاع بتاتے ہیں جبکہ امریکہ اسے دہشت گردی سے تعبیر کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ دہشت گردی تو ہے لیکن کیا اس کو صرف اسی طرح ختم کیا جاسکتا ہے یا اس کا کوئی اور طریقہ ہے۔ اب تک تو حملے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ بھارت امریکہ تعلقات میں سدھار کی شروعات بش نے ہی کردی تھی اور امید کی جاتی ہے کہ اوبامہ کے دور میں تعلقات مزید بہتر ہوں گے۔ ہندوستان کو اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ اگر وہ بھارت کے حق میں اس کے پڑوسیوں پر دباؤ بنائے گا تو اسے اس کی قیمت چکانی پڑے گی، وہ یہ سب بلامعاوضہ نہیں کرے گا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ بھارت امریکہ کی قربت اور پاکستان سے ناراضگی اس خطے کے لئے نیک فال نہیں ہے۔ پہلی دفعہ جنوبی ایشیا میں امریکہ کا دخل ہورہا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت ہر اعتبار سے امریکہ پر منحصر ہے۔ پاکستان کا امریکہ پر انحصار اور بھارت امریکہ دوستی یہ دو باتیں ہیں جو آنے والے دنوں میں تینوں ممالک کے آپسی تعلقات پر اثر کریں گی۔ اس خطے میں اس کا قیام بھارت پاک دوستی سے ہی ممکن ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ بھارت یہ چاہے گا کہ وہ امریکہ کے ذریعے چین پر دباؤ ڈالے۔ ہندوستان کا موازنہ ہم پاکستان سے نہیں کرسکتے کیونکہ یہاں پر جمہوریت مکمل طور پر مضبوط ہوگئی ہے۔ عوام کی رائے یہاں ضرور معنی رکھتی ہے جبکہ پاکستان میں رائے عامہ کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھارت میں سیکولرزم کی جڑیں مضبوط ہونی چاہئیں۔ ہم نے دیکھا کہ نیوکلیئر ڈیل پر اعتماد ووٹ کے دوران بڑی مشکل سے یہ سرکار بچی ہے۔ اس لئے مجھے نہیں لگتا کہ بھارت کے لوگ امریکہ کے حق میں جائیں گے۔ ہمیں امریکہ سے اقتصادی تعلقات، سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں مفاہمت کرنی چاہئے لیکن سیاسی معاملات میں ہم آزاد ہوں اور جو ہماری پالیسی ہے وہی کریں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان میں کچھ عناصر ہیں جو کہ ہندوستان مخالف بات کرتے ہیں جبکہ ان کے لئے بہتر آپشن یہ ہے کہ وہ یہاں سے دوستی کرنے کی بات کریں۔ میرے خیال میں کشمیر مسئلہ بھارت پاک کے رشتوں کے درمیان بیماری کی اصل وجہ نہیں بلکہ یہ بیماری کی علامت ہے۔ اگر جنوبی ایشیا میں امن چاہتے ہیں تو ان دونوں ملکوں کو آپسی تعلقات بہتر بنانے کی فکر کرنی ہوگی۔ دونوں ملک مسئلے کے حل کی سنجیدہ کوشش کریں تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ (گفتگو پر مبنی)

امریکہ کی مداخلت کی پالیسی برقرار رہے گی

برندا کرات، ممبر آف راجیہ سبھا

امریکہ کی صدارتی تبدیلی میں دو باتیں تجزیہ طلب ہیں۔ امریکہ کے اندرونی سیاسی حالات جس کی بنا پر یہ تبدیلی آئی جہاں افریقی نژاد امریکیوں کے خلاف امتیازی سلوک کیا جاتا تھا جس کو اوبامہ کے جیتنے کے بعد ظاہری طور پر رنگ ونسل کی بنیاد پر کی جانے والی سیاست کو دھچکا لگا ہے۔ یہ ان طاقتوں کے خلاف بڑی جیت ہے۔ جہاں تک عالمی پیمانے پر امریکہ کی سمجھ ہے اس کی وضاحت اوبامہ نے خارجہ پالیسی کے بیان میں کی ہے۔ عراق سے وہ اپنی فوجوں کو واپس بلانے کی بات کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی افغانستان میں انھوں نے مزید فوجیں بھیجنے کی بات بھی کی ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ مداخلت کے اپنے رویے پر پوری طرح قائم ہیں۔ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ ہم ایران سمیت دنیا کے دیگر مسلم ملکوں کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کیا ان کی یہ آرزو پوری ہوگی۔ وہ ایسا کرپانے میں آزاد ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے بڑا چیلنج ہے۔ اگر بھارت سرکار یہ سمجھتی ہے کہ امریکہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے وہ ہندوستان کا بھلا کرلیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے اور ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہے۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ اپنے مفاد اور اپنے ایجنڈے پر دنیا کو دیکھتا ہے اور یاد رہے کہ امریکہ کا ایجنڈا کبھی بھارت کا ایجنڈا نہیں بن سکتا۔ اب ملک کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ ہم اپنی آزاد خارجہ پالیسی کو کس طرح قائم رکھیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ان تمام ملکوں سے اپنی دوستی برقرار رکھیں جو ہمارے پرانے دوست تھے، جنہیں امریکہ اپنا دشمن سمجھتا رہا ہے۔ ہم ان دوستوں کو بنائے رکھیں نہ کہ امریکی ایجنڈے پر چلیں۔ جب ہم نے نیوکلیئر ڈیل کی مخالفت کی تو ہم نے اس وقت کہا تھا کہ یہ کوئی عام معاہدہ نہیں ہے اس کے ذریعے امریکہ کی کوشش ہے کہ بھارت اس کا دفاعی حلیف بن جائے اور اس کا سب سے زیادہ اثر بھارت کی خارجہ پالیسی پر پڑے گا جس پر اسی وقت سے عمل شروع ہوگیا ہے۔ ابھی فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل نے امریکہ کی حمایت سے جو غیر انسانی عمل کیا ہے اور غزہ پٹی پر حملہ کیا جس پر بھارت سرکار خاموش تماشائی بنی رہی اس کے برخلاف اسرائیل سے دس ہزار کروڑ کا میزائل پروگرام کا سمجھوتہ کیا ہے جبکہ ہمارے ملک کے پاس میزائل پروگرام موجود ہے۔ یہ سمجھوتہ اس ملک سے کیا گیا ہے جو سرتاپا کرپشن میں ڈوبا ہوا ہے۔ کیا یہ پیسہ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے حملے کی مدد نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان سے اس نے اپنے جاسوسی سٹیلائٹ لانچ کئے ہیں۔ یہ جو کچھ ہورہا ہے ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے لئے بے حد نقصاندہ ہے۔ اس وقت ملک کے سامنے بھارت کی آزاد خارجہ پالیسی کو بچانا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس وقت بھارت امریکہ کے سامنے جس طرح جھکا جارہا ہے یہاں تک کہ ہم نے ایف بی آئی کو اجازت دے دی کہ وہ ہمارے شہریوں کی تفتیش کرے آخر یہ کیا ہے؟ ہمیں چاہئے کہ اپنے تمام پڑوسیوں سے بہتر رشتے قائم رکھیں۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ امریکہ اور بھارت کے تعلقات ہوں لیکن وہ برابر کے ہوں، ایسا نہ ہو کہ ہم امریکہ کے جونیئر پارٹنر کے طور پر کام کریں۔ امریکہ کی ایسی دوستی جو دوسرے ملکوں کی دوستی کی قربانی کی بنیاد پر ہو قطعی برداشت نہیں ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنی آزاد خارجہ پالیسی پر قائم رہیں اور دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ تعلقات رکھیں۔ اپنی خارجہ پالیسی امریکہ کے ایجنڈے کو سامنے رکھ کر نہ چلائیں۔ امریکہ کے دوست اور اس کے دشمن کو ہی بھارت اپنے تعلقات کا معیار نہ بنائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ منموہن سنگھ سرکار اسی راستے پر ہندوستان کو چلانے کی کوشش کررہی ہے۔ (گفتگو پر مبنی)

امریکہ میں اقتدار کی تبدیلی عالمی سطح پر اثر انداز ہوگی

امریش مشرا، معروف کالم نگار، ممبئی

امریکہ میں صدارتی تبدیلی کا جائزہ لیتے وقت دو باتیں ملحوظ رکھنا چاہئے، اول یہ کہ اس تبدیلی سے اندرون امریکہ کیا اثرات مرتب ہورہے ہیں دوسرے یہ کہ عالمی پیمانے پر یہ تبدیلی کیا اثر انداز ہوگی۔ یہ بڑی حد تک درست ہے کہ امریکہ میں ایک سیاہ فام کا عہدہ صدارت تک پہنچنا ایک بڑی تبدیلی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے عالمی پیمانے پر کیا اثرات مرتب ہونے کا امکان ہے۔ ابھی کچھ روز قبل امریکی صدر بارک حسین اوبامہ نے بیان دیا کہ وہ عراق سے اپنی فوج واپس بلائیں گے اور خلیج گوانتاناموقید خانہ بند کردیں گے جس کے لئے انھوں نے ایک حکم نامے پر دستخط بھی کردیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ امریکی مجبور نہیں ہیں کہ وہ ہر بار اسرائیل کا ساتھ دیں، یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ امریکہ ایک بڑے ملک کی موجودہ سیاسی پالیسی میں تبدیلی چاہتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہیں کہ اوبامہ کا اقتدار میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکی عوام نے بش کی پالیسیوں کو مسترد کردیا ہے۔

میرے خیال میں امریکہ میں اس تبدیلی کی اصل وجہ عراق اور افغانستان میں امریکہ کی ناکامی ہے جس کے بارے میں امریکی انتظامیہ نے عوام کو گمراہ کیا کہ ہم وہاں کامیاب ہوئے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ان دونوں ملکوں میں امریکہ کی سخت مخالفت جاری ہے۔ جس کا مشاہدہ امریکہ کے لوگ کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ پوری دنیا میں امریکہ کی اس کارروائی کے خلاف آئے دن مظاہرے ہوتے رہے جس سے انہیں لگا کہ امریکہ کی موجودہ پالیسی مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہے۔ ادھر اسرائیل کو فلسطین اور لبنان دونوں مقامات پر مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اسرائیل یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ فلسطین میں خواتین اور بچوں کا قتل کرکے اپنا مقصد حاصل کرلے گا، لیکن فلسطینیوں کے حوصلے کمزور نہیں ہوئے۔ حزب اللہ نے اسرائیل کو شکست دی۔ ان مقامات پر جنگجوؤں کی شدید مخالفت کی وجہ سے ہی بارک اوبامہ لائے گئے۔ امریکی عوام اس بات کو سمجھتے ہیں کہ جارج ڈبلیو بش کی پالیسی میں مسلم مخالفت اور اسرائیل پرستی صاف ظاہر تھی۔ اس بات کی مخالفت جب عالمی پیمانے پر ہوئی تو امریکی عوام نے دیکھا کہ ہمیں عراق اور افغانستان کے معاملے میں گمراہ کیا گیا۔

حقیقت اس کے برعکس ہے۔

دنیا میں ترکی اور مصر دو مسلم ملک ہیں جو اسرائیل کے حلیف ہیں لیکن گزشتہ دنوں ترکی کے وزیراعظم نے کھلے عام ٹیلی ویژن پر اسرائیل کو دوٹوک جواب دے دیا کہ آپ تو عورتوں اور بچوں کے قاتل ہیں۔ مصر نے بھی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ سمجھنے کی بات ہے کہ ابھی یہ باتیں صرف بیانات تک ہی محدود ہیں، اس کو وہ عملی خاکے میں کیسے ڈھالیں گے یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ یہ بات درست ہے کہ اسرائیلی لابی بارک حسین اوبامہ کے سامنے دشواری ضرور پیدا کرے گی۔ بارک اوبامہ نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ امریکہ میں جو اقتصادی بحران آیا ہے اس میں بھی یہودی لابی کا ہاتھ ہے۔

بارک اوبامہ نے انتخاب جیتنے کے بعد کئی عہدوں پر یہودیوں کو فائز کیا تھا لیکن اب ان کے رخ میں تبدیلی نظر آئی ہے، انہیں صرف یہودیوں سے ہی نہیں بلکہ وہاں گوروں کا بھی ایک طبقہ ہے جو یہودیوں کے ساتھ مل کر بش انتظامیہ کی آخر وقت تک پشت پناہی کرتا رہا اس لئے ان طاقتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ بارک حسین اوبامہ کے یہ چار سال بہت اتھل پتھل بھرے ہوں گے۔

جہاں تک ہندوستان اور امریکہ تعلقات کی بات ہے بھارت نے بش انتظامیہ کے زمانے میں جو بڑی امیدیں لگا رکھی تھیں وہ پوری نہیں ہوں گی کیونکہ بارک اوبامہ جارج ڈبلیو بش کے زمانے میں کئے گئے بہت سے کاموں میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ تعلقات تو بہتر ہی رہیں گے لیکن اگر بھارت یہ سمجھتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں پاکستان پر حملہ کرلے جائے گا تو یہ بڑا مشکل ہے کیونکہ وقت کا تقاضا ہے کہ بارک حسین اوبامہ مسلم دنیا سے اپنے تعلقات بہتر بنائیں۔ انہیں اس کے لئے داخلی اور خارجی مخالفت کا شدید سامنا کرنا پڑسکتا ہے اور آنے والے دنوں میں اپنے مخالفین سے ان کی لڑائی خطرناک رخ اختیار کرسکتی ہے۔ ان پر جان لیوا حملے بھی ہوسکتے ہیں۔ بارک اوبامہ اپنے موقف میں تبدیلی بھی لاسکتے ہیں اور امریکہ اور بھارت کے تعلقات میں بھی بڑی اتھل پتھل ہوگی کیونکہ امریکہ کی یہ خواہش ہے کہ وہ بھارت کو چین اور پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کرے اور روس پر بھی نظر رکھے۔ جبکہ اس خطے کے لئے زیادہ بہتر ہوتا کہ جنوبی ایشیا کے بڑے ممالک اپنا کوئی اتحاد بناکر یہ طے کریں کہ امریکہ کے ساتھ کس حد تک تعلقات قائم کیا جائے ورنہ کسی ایک ملک کے ساتھ تعلقات اس پورے خطے میں بے چینی کا سبب بنیں گے۔ اس وقت بھارت میں امریکہ دوستی کو لے کر دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو ہر قدم پر امریکہ کا ساتھ دینا چاہتا ہے دوسرا طبقہ وہ ہے جو امریکہ سے تعلقات کی بہتری تو چاہتا ہے لیکن ملک کی آزاد خارجہ پالیسی کو اپناتے ہوئے تمام پڑوسیوں سے بہتر تعلقات کا خواہاں ہے۔ ہمیں بھارت امریکہ تعلقات کا جائزہ معاشی نقطۂ نظر سے بھی لینا ہوگا کیونکہ وہ بھارت کے بازار میں اپنے رسوخ کو بڑھائے گا۔ یہی وہ اقتصادی خطرہ ہے جس کے ذریعے ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح ایک بار پھر امریکی پالیسیوں کے غلام بن کر نہ رہ جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ بھارت کی دو بڑی سیاسی پارٹیاں اس بارے میں کوئی واضح نظریہ نہیں رکھتیں، ایک رام کے نام پر سیاست کرتی ہے تو دوسری پاکستان کی مخالفت کی بنیاد پر، لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ آئندہ پارلیمانی انتخاب میں بھارت، امریکہ تعلقات ایک اہم ایشو بن کر ابھرے گا اور الیکشن کے بعد بایاں بازو کی پارٹیوں کی مدد سے تیسرا مورچہ ضرور وجود میں آئے گا جو آئندہ حکومت سازی میں کلیدی رول ادا کرے گا۔

ہم امریکہ سے تعلقات کے خلاف نہیں ہیں، لیکن اس میں حد متعین کرنا چاہئے تاکہ ہماری آزادی اور خودمختاری کو مستقبل میں کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ بھارت امریکہ اور اسرائیل سے ہتھیاروں کی سودے بازی نہ کرے اور بھارت میں امریکی سرمایہ کاری پر نظر رکھی جائے۔ دراصل امریکہ اور اسرائیل کا ناپاک ارادہ ہے کہ اس خطے میں جنگ کا ماحول قائم کرکے بھارت کو ہتھیار فروخت کریں۔ (گفتگو: اشرف بستوی)

موضوع سخن

امریکہ، نئے صدارتی انتخاب کے بعد

براعظم امریکہ کا شمالی حصہ، جسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور عرف عام میں صرف امریکہ کہا جاتا ہے، معاشی اور عسکری لحاظ سے بڑی طاقت پہلے بھی تھا جب اس کے مقابلے پر سوویت یونین کے نام سے مختلف ریاستوں کا اُسی طرح کا مجموعہ موجود تھا، مگر تقریباً بیس سال قبل سوویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکہ واحد بڑی طاقت کے طور پر باقی رہ گیا ہے اور اس کی یہ حیثیت پوری دنیا تسلیم بھی کرتی ہے۔ جب سوویت یونین موجود تھا تو دنیا میں بڑی حد تک طاقت کا توازن برقرار تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی طاقت کسی تیسرے ملک یا ملکوں کے مجموعے کے خلاف کھلی جارحیت کا ارتکاب نہیں کرسکتی تھی اور جب کبھی ایسا ہوا تو دنیا میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ لیکن اس طرح کی جارحیت زدہ ملک کی حمایت میں دوسری طاقت کھڑی ہوگئی۔ لیکن اب طاقت کا یہ توازن ختم ہوچکا ہے۔ امریکہ واحد مادی قوت ہے، جس ملک کے خلاف جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ وہ ان ملکوں کے خلاف بھی جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے جو سرد جنگ کے دور میں اس کے حلیف تھے جبکہ بہت سے وہ ممالک جو سرد جنگ کے زمانے میں سوویت یونین کے حلیف یا قریبی دوست تھے، امریکہ کے دائرۂ اثر میں برضا ورغبت آچکے ہیں—اب اس کے سامنے پرانی وفاداریاں نہیں بلکہ صرف موجودہ مفاد ہے۔ مختلف ممالک بھی اس کے ساتھ اسی بنیاد پر تعلق رکھتے ہیں (یا رکھنے پر مجبور ہیں) کہ انہیں اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے—اس پس منظر میں امریکہ کا صدارتی انتخاب صرف اس حد تک اپنی معنویت رکھتا ہے کہ وہ کیا جزوی تبدیلیاں ہیں جو دنیا میں آسکتی ہیں۔ کسی بنیادی تبدیلی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے بارک اوبامہ کا انتخاب اس لحاظ سے غیر معمولی ہے کہ امریکہ کی چار سو سالہ تاریخ میں پہلی بار ایک سیاہ فام باشندہ صدر منتخب ہوا ہے نیز اوبامہ کے کچھ پالیسی بیانات بھی ہیں جو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جائزہ کے اس شمارے کے ذریعے قارئین کرام کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ملک کے اصحاب الرائے اس سلسلے میں کیا احساسات رکھتے ہیں—ایڈیٹر

نظام میں کسی بڑی تبدیلی کی امید درست نہیں ہے

انل چمڑیا، سماجی کارکن، نئی دہلی

ہم امریکہ کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں جیسے کہ پہلے امریکہ تھا۔ ہمارا ماننا ہے کہ اگر کسی عمارت کا رنگ وروغن بدل جائے تو اس کو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی عمارت پوری بدل گئی ہے۔ ہمارے معاشرے میں کئی طرح کے بھید بھاؤ ہیں۔ اس میں ایک رنگ ونسل کا بھی ہے۔ اگر یہ دور کرلیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے معاشی تفریق کو بھی دور کرلیا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی کا مزاج لوٹنے کا ہے تو کیا اس کے رویے میں کوئی تبدیلی آئی۔ ہم اس تبدیلی سے بہت امید نہیں کرتے کیونکہ اس طرح کی تبدیلی نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا میں رونما ہورہی ہے۔ خواتین کو حکومت میں حصہ داری دی جارہی ہے جہاں سیاہ فام نہیں تھے وہاں سیاہ فام آرہے ہیں۔ دلتوں کو اقتدار میں آنے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ سب نئے اقتصادی نظام کو قائم رکھنے کے لئے کیا جارہا ہے یعنی سیاسی نظام اپنی جگہ برقرار ہے صرف چہرے بدل رہے ہیں۔ صرف چہرے تبدیل ہونے سے حالات نہیں بدلیں گے بلکہ موجودہ عالمی نظام میں بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے جس سے انسانوں کو حق اور انصاف حاصل ہو، کسی بھی ملک کا دوسرے ملک سے تعلق پر اس بات کا زیادہ اثر ہوتا ہے کہ اس ملک کا با اثر طبقہ کیا سوچتا ہے۔ اگر ہم اس وقت امریکہ کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ ہماری سوسائٹی کا با اثر طبقہ امریکہ کے ساتھ ہے اور وہی حکومت کے رخ کو طے کررہا ہے، لیکن جب آندولن کا دور ہوتا ہے تو سرکار کی اتنی ہمت نہیں ہوسکتی کہ وہ امریکہ کے ساتھ کوئی معاہدہ اپنے طور پر کرلے۔

میرے خیال میں امریکہ کی خارجہ پالیسی میں کوئی تبدیلی کی امید فضول ہے جو لوگ ایسی امید کرتے ہیں انہیں دھوکا ہے۔ ہمیں یہ جان لینے کی ضرورت ہے کہ امریکہ نے دنیا میں اسرائیل کے موافق اور اسلامی ممالک کے خلاف جو رخ اپنا رکھا ہے اس کا مقصد اپنی ساکھ کو بچانے کے لئے ہے تاکہ وہ پوری دنیا پر حکومت کرسکے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اوبامہ کے آنے سے بھارت امریکہ تعلقات میں کوئی بڑی تبدیلی آئے گی۔ دراصل اس وقت امریکہ پر جو دباؤ کی کیفیت طاری ہے اس میں اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ ہم مسلم ملکوں کے ساتھ بہتر تعلقات کے خواہاں ہیں کیونکہ اب وہ اور زیادہ دن عراق میں رہنے کی پوزیشن میں ہے۔ اس وقت بھارت کے ساتھ امریکہ کے تعلقات گہرے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس لئے کہ امریکہ چاہتا ہے کہ اگر بھارت سے اس کے تعلقات اچھے ہوجاتے ہیں تو اسے اس خطے میں کسی اور حلیف کی ضرورت نہیں باقی رہ جاتی۔ اب تک پاکستان سے وہ دوستی اس لئے بھی کررہا تھا کہ وہ بھارت پر دباؤ بنائے نیز امریکہ یہ بھی جانتا ہے کہ چین اس کے لئے چیلنج بن کر ابھر رہا ہے وہ اسے اپنے لئے خطرہ تسلیم کررہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بھارت سے بہتر پلیٹ فارم اس کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے جہاں سے ہر طرف نظر رکھ سکے۔

دوسری جانب دنیا میں امریکہ گلوبلائزیشن کا علمبردار بھی بنا ہوا ہے جس کی ناکامی پر بھی چاروں طرف سے سوال اٹھ رہے ہیں، اس کا مقابلہ کرنا امریکہ کے لئے سب سے بڑی چنوتی ہے۔ اس گلوبلائزیشن کا نقصان یہ ہوا کہ آج دنیا میں کچھ لوگ بہت پرامید ہیں وہیں دوسری جانب غربت کا سمندر ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جب امریکہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ دنیا کو چلا رہا ہے تو ان تمام سوالوں کا جواب بھی امریکہ کو ہی دینا ہے۔ اوبامہ سے کوئی توقع کرنا کہ وہ آتے ہی سب کچھ بدل دیں گے صحیح نہیں ہے۔ ہماری یہ سوچ کہ ہم حکمراں کے بدلنے سے کسی تبدیلی کی امید باندھ لیتے ہیں درست نہیں کیونکہ اصل تبدیلی تو نظام کی تبدیلی سے ہی ممکن ہے جس پر کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ یوپی اے حکومت نے اپنے مخلوط ایجنڈے میں صاف طور پر یہ بات کہی تھی کہ کسی بھی ملک کے تئیں اس کا جھکاؤ نہیں ہوگا۔ ایک طرف سے سبھی سے وہ بہتر تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کی خارجہ پالیسی اس ایجنڈے کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کے زیر اثر ہے اس کی ناوابستہ شبیہ بالکل ختم ہوچکی ہے۔ (گفتگو پر مبنی)

اقتدار کی تبدیلی کا مطلب پالیسی میں تبدیلی نہیں

صبغۃ اللہ ندوی

کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی کو تبدیل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس میں لچک اور گنجائش تو پیدا کی جاسکتی ہے لیکن یکسر تبدیل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ کام کسی انقلاب ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ امریکہ کے بارے میں تو خاص طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہاں حکومتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں لیکن خارجہ پالیسی جوں کا توں برقرار رہتی ہے۔ حکومت کی تبدیلی کے اثرات اس پر ظاہر نہیں ہوتے، ہاں دیگر ممالک سے تعلقات میں کمی وبیشی ضرور دیکھنے کو ملتی ہے لیکن بنیادی خارجہ پالیسی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ تعلقات میں کمی وبیشی کا مقصد نئے نئے مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔ امریکہ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر صدر کے دور میں یہی صورتحال دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ اپنے پیش رو کی خارجہ پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے تعلقات کے کچھ نئے باب نئے مقاصد کے لئے کھولتا ہے اور وہ اسی نہج پر کام کرتا رہتا ہے۔

ہند۔امریکہ تعلقات اگرچہ کافی پرانے ہیں، سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے آٹھ سالہ دور حکومت میں دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو اتنا فروغ حاصل ہوا جس کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی، جب دونوں ملکوں کے درمیان جوہری معاہدہ ہوا تو اسے تعلقات میں غیر معمولی پیش رفت سے تعبیر کیا گیا اور یہ

باقی صفحہ ۶ پر

کیا ایسے سازشی بھارت کے دوست ہو سکتے ہیں؟

ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی، دہرہ دون

ممبئی اے ٹی ایس نے مالیگاؤں بم دھماکہ کیس میں جو چارج شیٹ داخل کی ہے اس کی جو رپورٹنگ میڈیا میں آرہی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ کرنل پروہت کا گروہ ہندوستان کو ایک ہندو راشٹر بنانا چاہتا ہے۔ فوج میں پروہت کے ایک معاون افسر نے جو ابھی فوج میں تعینات ہے اور سرکاری گواہ بن گیا ہے ، بتایا کہ ہمارے لوگوں کی ایک میٹنگ، جس میں سی آئی اے کا آدمی اور 'را' کا سابق افسر بھی شریک تھا، ۱۲ر اپریل ۲۰۰۸ء کو بھوپال کے رام مندر میں ہوئی تھی، خود پروہت نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ اسرائیل کی مدد سے یہ مشن پورا کرنا چاہتا تھا۔ اسرائیل نے ہمیں ہرممکن مدد کا یقین دلایا تھا اور ہم سے پہلے ہوم ورک کرنے کے لئے کہا تھا۔ (دینک جاگرن، ۲۱ر جنوری اور دینک ہندوستان، ۲۳ر جنوری)

یہ خبریں اخباروں اور میڈیا میں ایک دن جھلک دکھا کر غائب ہوگئیں۔ مگر حیرت اور تشویش کی بات یہ ہے کہ میڈیا، سیاسی پارٹیاں، سیکولر دانشور، قانون داں، قومی مفاد کے ٹھیکیدار، مرکزی حکومت کے ذمہ داران، دفاعی امور کے ماہرین، بھگوا بریگیڈ کے کارکن سب کے سب خاموش رہے۔ حیرتناک بات یہ ہے کہ یہ تمام انکشافات ثبوتوں کے ساتھ ہندوستان کی ریاستی پولیس کے خصوصی دستہ نے عدالت میں لگائے ہیں۔ کسی مولوی یا مدرسہ کے ذمے دار یا لالو پرساد یادو اور ملائم سنگھ یادو نے نہیں لگائے ہیں۔ اتنی بڑی سازش کی تفصیلات اے ٹی ایس اپنی ۴۵۰۰ صفحات کی چارج شیٹ درج کرتی ہے جس میں ہمارے دو نئے سب سے عزیز اور ہمدرد دوست ممالک کے حوالے سے یہ بات بتائی جاتی ہے کہ وہ ملک کو توڑنا چاہتے ہیں۔ یہاں 'ہوم ورک' کے نام پر بم دھماکوں اور ''ردعمل'' کی جھڑی لگانا چاہتے ہیں اور پورے ہندوستان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہیں سے امریکہ اور اسرائیل کے ناپاک ارادوں کے خلاف آواز نہیں اٹھتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے دوست نما دشمن آستین کے سانپ ملک توڑنے کی سازش کریں تو سارے ''دیش بھگت'' خاموشی اختیار کرلیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان الزامات میں کچھ بھی ناممکن یا ایسا ہے کہ جس کو ان ممالک کی گزشتہ کارستانیوں کی روشنی میں بعید از قیاس سمجھا جائے۔ سب جانتے ہیں کہ اسرائیل اور امریکہ کے تعلقات کتنے قریبی بلکہ جسم وجان کی طرح رہے ہیں، مگر اسرائیل نے تاریخ میں بار بار امریکہ کو نقصان پہنچایا ہے یا پہنچانے کی کوشش کی ہے تاکہ اسے اشتعال دلایا جائے۔ قریب ترین مثال یمن کی ہے جہاں امریکی سفارت خانے پر اکتوبر ۲۰۰۸ء میں حملہ ہوا، کئی لوگ مارے گئے۔ دسمبر ۲۰۰۸ء میں یمنی صدر علی عبداللہ صالح نے پریس کو بتایا کہ پکڑے گئے ملزموں کا تعلق اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد سے تھا۔ اس کے بعد ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ جہاں تک امریکی سی آئی اے کا تعلق ہے سب جانتے ہیں کہ وہ کس طرح ''دوست ممالک'' میں دوستوں کو ''تحفظ'' دیتی ہے اور انہیں مرحوم شاہ فیصل اور جنرل ضیاء الحق کی طرح صاف بھی کراتی رہتی ہے۔ ہندوستان میں سی آئی اے کی کارستانیاں ایسی تھیں کہ اندرا گاندھی کے زمانے میں سی آئی اے کا ایجنٹ ویسے ہی گالی تھی جیسے آج القاعدہ اور آئی ایس آئی ہے۔ کیا سی آئی اے نے اپنا کردار بدل لیا ہوگا؟ حال میں ہی یہ تازہ سامنے آیا کہ بیرونی خفیہ ایجنسی 'را' کے اعلیٰ ترین افسر کو سی آئی اے نے اپنا ایجنٹ بنا رکھا تھا اور راز کھلنے پر اسے نیپال کے راستے باہر نکال کر امریکہ بھیج دیا۔ بحریہ وار روم لیک کے معاملے میں بھی بیرونی ایجنسیاں ملوث پائی گئی ہیں۔ سابق این ڈی اے حکومت میں شور اٹھا تھا کہ پرائم منسٹر ہاؤس پی ایم او میں ایک امریکی بھیدی "Mole" ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ خفیہ ایجنسیوں پر اربوں روپے اسی لئے خرچ کیے جاتے ہیں کہ وہ اپنے ملکی مفادات کے لئے دنیا بھر میں کارروائیاں کریں۔ ان کارروائیوں کے مکروہ چہرے اور انسانیت کش اثرات دنیا بھر میں دیکھے جارہے ہیں۔ ہر جگہ یہ طاقتور ایجنسیوں کا خفیہ کھیل ہے جو انسانوں کی بربادی، قتل و خون کی شکل میں کھیلا جارہا ہے۔

پروہت نے اپنی تفتیش کے دوران خاص طور سے اسرائیلی مدد کا ذکر کیا ہے اور اسرائیلی رہنمائی یعنی ''ہوم ورک'' یا ابتدائی کام کا ذکر کیا ہے۔ اس تعلق سے موساد کے ایک منحرف ایجنٹ وکٹر اوسٹروسکی (Victor Ostervsky) کی کتاب ''فریب کا دوسرا چہرہ'' نظروں سے گزری، اس میں سے کچھ مثالیں ان واقعات کی پیش ہیں جو کہ زمانہ قریب میں وقوع پذیر ہوئے ہیں اور جس سے اس ایجنسی کے خبیث اور مکروہ چہرے سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسے دھوکہ باز اور پیچھے سے وار کرنے والے ملک کو ہم اپنا سب سے قریب دوست بتا رہے ہیں۔ اس سے اربوں ڈالر کے ہتھیار خرید رہے ہیں۔ اس کے ایجنٹوں کو اپنے یہاں حفاظت کے لئے بلا رہے ہیں، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام مفادات کے حصول کے لئے ہی ہمارے ملک میں دھماکوں، قتل، دہشت گردی اور فساد کا بازار بالواسطہ اور بلاواسطہ کرا رہا ہو؟ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوسکتی ہے۔

(۱) ۱۶ر اپریل ۱۹۸۶ء کو ایک سو پچاس امریکی بمبار طیاروں نے لیبیا پر ساٹھ ٹن بم گرائے۔ اس حملے میں لیبیا کے چالیس شہری کرنل قذافی کی بیٹی سمیت شہید ہوئے۔ اس حملے پر امریکہ کو اکسانے کے لئے موساد نے آپریشن ٹروجن ۱۳ر اور ۱۸ر فروری ۱۹۸۶ء کی درمیانی رات میں شروع کیا۔ دو اسرائیلی کشتیاں جو میزائلوں اور دوسرے اسلحے سے لیس تھیں اور ایک ہیلی کاپٹر بھی تھا۔ بحر روم میں آبنائے سسلی سے گزر کر طرابلس کے پاس لیبیا کے پانی میں داخل ہوگئیں، اس کشتی سے بارہ کمانڈو چار چار کی شکل میں باہر نکل کر تیز رفتار کشتیوں میں ساحل کی طرف چل پڑے۔ ساحل پر اتر کر انھوں نے ایک سبز رنگ کا چھ فٹ لمبا اور سات انچ موٹا سلنڈر 'ٹروجن' اٹھا لیا اور ساحل پر کھڑی وین میں سوار ہوکر طرابلس کے لئے روانہ ہوگئے۔ طرابلس میں یہ وین الجمہوریہ اسٹریٹ کی ایک رہائشی عمارت کے عقب میں پہنچ گئی۔ جہاں یہ سلنڈر ایک قالین میں لپیٹ کر ایک پانچ منزلہ عمارت میں لے جایا گیا اور پانچویں منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں ڈش انٹینا لگا کر نصب کردیا گیا۔ اس عمارت سے تین بلاک دور کرنل قذافی کا ہیڈ کوارٹر اور رہائش تھی۔ موساد کے لوگوں نے یہ اپارٹمنٹ کرایے پر لے رکھا تھا اور چھ مہینے کا کرایہ پیشگی ادا کردیا تھا۔ اس کے بعد یہ کمانڈو واپس کشتیوں کے ذریعے چلے گئے۔ اس سلنڈر میں پیغامات نشر کرنے کے آلات تھے۔ اس آلے کا آئی ڈی پی نیوی جہاز سے رابطہ تھا۔ جو قریب ہی سمندری ساحل پر کھڑا ہوا پیغامات نشر کر رہا تھا۔ ان پیغامات کو یہ سلنڈر وصول کرکے دوبارہ نشر کرتا تھا۔ مارچ کے آخر تک امریکیوں نے اس ٹروجن سے پیغامات وصول کرنے شروع کردیے جس میں ایسے پیغامات تھے جو دنیا بھر کے لیبیائی سفارت خانوں کے لئے ہوتے تھے جس میں انہیں دہشت گردی کے احکام جاری کئے جاتے تھے۔ امریکی ان پیغامات کو پکڑ کر سمجھے کہ لیبیا مغربی ممالک پر حملے کر رہا ہے اس لئے وہ بھڑک اٹھے۔ موساد بالکل یہی اطلاعات مغربی ممالک کو بھی فراہم کرتا تھا جس سے ایسا لگتا تھا کہ لیبیا سے پکڑے گئے احکام قطعی صحیح ہیں۔ اس دوران مغربی برلن کے لا بیلے کے ڈسکوتھک میں دھماکہ ہوا، ایک امریکی شہری مارا گیا۔ الزام لیبیا کے سر لگا کر بمباری کردی گئی۔ اسرائیل کا مقصد پورا ہوگیا۔

(۲) اردن امریکہ کا سب سے بڑا حلیف ہے وہاں موساد نے دوستی کا حق اس طرح ادا کیا: موساد نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اردن کی حکومت غیر مستحکم کرنے کے لئے وہاں انتشار پھیلانے کا یہ اچھا موقع ہے۔ انتشار پھیلانے کے لئے بہت سی جعلی کرنسی مارکیٹ میں پھیلا کر حماس کی طرز پر مذہبی انتہا پسندوں کو مسلح کرکے ، اخوان المسلمون کو مضبوط کرکے استحکام کے علمبردار کسی رہنما کو قتل کرکے اور یونیورسٹیوں میں فساد کرا کر حکومت کو سخت اقدامات پر مجبور کردیا جائے گا اور حکومت اپنی حمایت کھودے گی۔ (صفحہ ۱۶۴)

(۳) مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے دوسرے سب سے بڑے دوست مصر کے ساتھ موساد کا رویہ یہ تھا۔ موساد افغانستان کے ذریعے مصری بنیاد پرستوں کو ہتھیار دے رہی تھی۔

(۴) کویت کی پائپ لائنوں پر حملے کرنے کی تربیت عراق کے لوگوں کو موساد ہی دے رہی تھی۔ (صفحہ ۱۳۸)

(۵) عراق، ایران جنگ کے دوران موساد نے جرمنی ڈنمارک کے توسط سے ایران کے فینٹم امریکی جہازوں کے لئے ہوا بازوں کو جرمنی میں تربیت دی اور بڑی مقدار میں اسلحہ گولہ بارود وغیرہ ایران کو فروخت کیا۔ (صفحہ ۱۸۲، ۲۵۰)

(۶) مصر میں اخوان کو افغانستان سے اسلحہ بھیجنے کی لائن بڑی طویل تھی۔ اس کیلئے وہ صحرائے سینائی میں گھومنے والے خانہ بدوشوں کو استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ مصر میں اسلحہ داخل ہونے کے بعد وہ مطلوبہ لوگوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ اس اسلحہ کے معاوضے کے طور پر موساد مصر کے اندر ایسے ٹھکانے بتاتی تھی جس پر حملہ مطلوب ہوتا تھا۔ ان کا ہر وقت ایک مقصد ہوتا تھا، غیر مستحکم، عدم استحکام (صفحہ ۲۲۲)

(۷) جنوبی افریقہ میں سیاہ فام لوگوں پر کیمیاوی اشیاء کا تجربہ موساد نے کرایا۔ (صفحہ ۲۵۶)

(۸) ایران، عراق جنگ ختم ہوچکی تھی۔ موساد امریکیوں سے صدام حسین کا تختہ الٹنے کے لئے کہہ رہی تھی اور ساتھ ہی واشنگٹن میں اسرائیلی سفارت خانے کے ذریعے صدام حسین کو اس کی زندگی اور حکومت سے متعلق مختلف حملوں سے خبردار بھی کر رہی تھی۔ موساد صدام حسین کو علاقے میں اپنا بڑا اثاثہ سمجھتی تھی۔ کیونکہ جہاں تک بین الاقوامی سیاست کا تعلق ہے صدام اس سے بے بہرہ تھے۔ وہ کوئی بھی ایسی احمقانہ حرکت کرسکتے تھے جس سے موساد فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ جس چیز سے موساد خوفزدہ تھی وہ عراقی فوج کی تعداد تھی۔ ۱۹۸۸ء میں موساد نے اسرائیلی وزیر خارجہ کو مشورہ دیا کہ وہ عراق کے ساتھ امن مذاکرات ترک کردے۔ اس وقت امریکہ اور فرانس کی حمایت سے اسرائیل، اردن اور عراق کے مابین خفیہ طور پر امن بات چیت ہو رہی تھی جس میں مصر اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ موساد نے سارے معاملات کو ایسا رخ دیا جس سے ظاہر ہونے لگا کہ عراق امن مذاکرات سے خوش نہیں تھی۔ موساد نے امریکہ کو یہ باور کرادیا کہ عراق کچھ اور چاہتا ہے۔ جنوری ۱۹۸۹ء میں اسرائیلی نفسیاتی جنگی مشن نے صدام حسین کو دنیا کے سامنے ایک ظالم وخطرناک آدمی کے طور پر پیش کرنا شروع کردیا۔ اس نے اپنے ہر آدمی کو متحرک کردیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل میں اپنے رضاکار ایجنٹوں سے لے کر امریکی کانگریس میں اپنے مکمل زرخرید لوگوں تک کے ذریعے شور مچایا کہ صدام حسین اپنے ہی آدمیوں کو ہلاک کر رہا ہے۔ تصویروں میں کرد ماؤں کو اپنے مردہ بچوں کو سینے سے لگائے دکھایا گیا کہ یہ سب عراقی فوج کے زہریلی گیس کے حملے کا نتیجہ تھا۔ دوسری طرف کرد بغداد کے خلاف ایک بھرپور گوریلا جنگ میں مصروف تھے، انہیں بھی موساد ہی اسلحہ سپلائی کر رہی تھی اور مشورہ و رہنمائی بھی دے رہی تھی۔ موساد پریس کو نام نہاد ''معتبر ذرائع'' کے ذریعے سے بتا رہی تھی کہ کس طرح صدام حسین اپنے ہاتھوں سے اپنے لوگوں کو مار رہا ہے اور ایرانی شہروں پر بم برسا رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ بھی تھی کہ یہ بم ایرانی شہروں پر امریکی سٹیلائٹ کی مدد سے برسائے جاتے تھے۔ موساد چاہتی تھی کہ عراقی فوج کی تباہی امریکہ کے ہاتھوں ہوتا کہ اسرائیل کو اس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

(صفحہ ۲۶۷۔۲۶۸)

(۹) اکتوبر ۱۹۸۳ء میں بیروت میں امریکی اڈے پر خودکش حملے میں ۲۴۱ امریکی بحری سپاہی ہلاک ہوئے۔ اس حملے کی اطلاع موساد کو تھی اور اسے حملہ آور کار اور اس کی ساخت کے بارے میں بھی معلوم تھا مگر اس نے یہ اطلاع امریکی انٹیلجنس تک نہیں پہنچائی۔

(۱۰) ۱۹۵۰ء میں اسرائیلی وزیر دفاع پیناس لیون کے حکم پر امریکہ، مصر تعلقات خراب کرنے کے لئے مصری یہودیوں کا ایک دہشت گرد گروہ مصر میں امریکی ٹھکانوں پر حملے کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ منصوبہ ناکام ہوگیا۔ دہشت گرد پکڑے گئے۔ (صفحہ ۲۸۸)

(۱۱) بھارت میں ۲۶/۱۱ ممبئی حملے کے تناظر میں اس انکشاف پر خاص طور پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۹۱ء میں صدر بش نے میڈرڈ (اسپین) میں اسرائیل اور عرب ممالک اردن، شام اور مصر کی کانفرنس منعقد کرائی۔ بش نے کافی دباؤ ڈال کر اسحاق شمیر کو میز پر آنے کے لئے راضی کیا تھا۔ نتیجتاً موساد نے حکمرانوں کی مرضی بھانپ کر کچھ ایسا کرنے کے لئے کہا جس سے فلسطینیوں اور امریکیوں میں ہمیشہ کے لئے دشمنی ہوجائے۔ انھوں نے طے کیا کہ فلسطینیوں کے ذریعے اس کانفرنس کے دوران مسٹر بش کو قتل کرا دیا جائے۔ چونکہ اسپین میں کانفرنس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی موساد کو ہی کرنی تھی اس لئے یہ کام مشکل بھی نہیں تھا۔ موساد کے خاص یونٹ 'کدوم' نے تین فلسطینیوں کو بیروت میں اپنے ساتھ بلایا اور صحرا میں ایک کیمپ گاہ میں منتقل کردیا۔ ان کے نام بیج دین ہلدے، محمد حسین اور حسین شاہین تھے۔ ساتھ ہی امریکی صدر کو اصلی اور نقلی دھمکیاں بھی ملنی شروع ہوگئیں۔ دھمکیاں ابوندال گروہ کے نام پر فرضی طور پر دی جارہی تھیں۔ ہسپانوی پولیس کو کسی طرح یہ معلوم ہوگیا تھا کہ دہشت گرد میڈرڈ آرہے ہیں۔ اس خبر کو اوسٹروسکی نے کسی طرح امریکہ کے ایک ذریعے تک پہنچایا جو مسٹر جارج ڈبلیو بش کا قریبی دوست تھا۔ اس نے سکریٹ سروس کو آگاہ کردیا اور منصوبہ پر عمل نہیں ہوپایا۔ اور بیچارے ان تینوں فلسطینیوں کو اسرائیل لے جاکر نیس زیونی کے تحقیقاتی مرکز میں قتل کردیا گیا۔ یہ خبر اس زمانے میں مشہور کالم نگار جیک انڈرس نے لکھی تھی اور خاتون کالم نگار جین ہنٹر نے بھی کالم لکھا تھا۔

(صفحہ ۳۰۱۔۳۰۴)

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ موساد خود ہی محافظ بھی تھی اور خود ہی قاتل کا انتظام بھی کرا رہی تھی اور بش کو قاتلوں کے قریب تر لانے کا موقع بھی وہی فراہم کرنے والی تھی اور مزے کی بات یہ کہ فلسطینی اپنے تئیں یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ ایک بڑے دشمن کو ختم کرنے والے ہیں اور شاطر یہودی دونوں ہاتھوں میں لڈو لئے ہوئے تھے۔ اگر بش کا قتل ہوجاتا تو پلان یہ تھا کہ یہ تینوں فلسطینی موساد کے 'محافظوں' کے ذریعے وہیں شہید کردیے جاتے، صرف یہ پتہ چلتا کہ وہ فلسطینی تھے۔ ظاہر ہے امریکہ میں اور دنیا بھر میں غصہ ونفرت فلسطینیوں کے خلاف بھڑکتا، ان کا کچھ فائدہ بھی نہ ہوتا اور جس کا فائدہ ہوتا وہ کوتوال بھی تھا اور چور بھی تھا۔ اس واقعے کی روشنی میں اگر ممبئی کے ۱۱ر ۲۶ حادثے کو دیکھیں تو حیرت انگیز مماثلت محسوس ہوتی ہے۔

موساد کے جس منحرف افسر اوسٹروسکی کی کتاب کے اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب پہلے سال ہی دس لاکھ کی تعداد میں فروخت ہوئی اور دنیا کی پندرہ بڑی زبانوں (عبرانی کو چھوڑ کر) اور بیس ممالک میں فروخت ہوئی۔ کنیڈا اور امریکہ میں اس پر عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش بھی ہوئی، مگر وہ ناکام ہوگئی۔ کتاب دنیا کے دیگر ممالک میں خصوصاً یہودی تنظیموں کے طریقہ کار اور نیٹ ورک کی حیران کن تفاصیل ہیں۔ کس طرح موساد ایل ٹی ٹی ای کو بھی اسلحے دیتی رہی اور حکومت سری لنکا کو بھی۔ مصر کی حکومت کی بھی مدد کرتی رہی اور اخوان اور عسکری گروپ کو بھی اسلحے دیتی رہی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ جتنا ہم موساد کے بارے میں جانتے ہیں کیا ہماری حکومت اور اس کے خفیہ ادارے نہیں جانتے؟ یہ کتاب انگریزی میں شائع ہوتی ہے اسے کہیں بھی اسرائیل چیلنج نہیں کرسکے اور نہ جھٹلا سکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب حقیقت ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسرائیل جو دنیا میں امریکہ کا سب سے بڑا مدد حاصل کرنے والا ملک ہے جو امریکہ کا سب سے بڑا نمک خوار ہے وہ اتنا بڑا نمک حرام ہے کہ ضرورت کے لئے اپنے پالنے پوسنے والے کو بھی بار بار ڈس لیتا ہے تو ہمارے ملک کے سیاستدانوں، دفاعی ماہرین، ہندوتووادی دیش بھگت کس بھروسے پر اسرائیل اور موساد کو بلانے پر آمادہ ہیں۔ جس مکار ریاست نے اپنے آقا کے خلاف بار بار چالیں چلیں وہ اپنے مفاد کے لئے ہمیں داؤں پر کیوں نہیں لگائے گی؟ ●●

حماس فلسطینیوں کے احتجاج کا دوسرا نام ہے

نیر زیدی (واشنگٹن)

بش انتظامیہ کی سرپرستی اور حمایت کے ساتھ اسرائیل نے غزہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لیکن اس کے باوجود انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ ۱۸ روزہ وحشیانہ بمباری سے اپنے سیاسی اور فوجی اہداف پورے کرسکے یا نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ براک اوباما صدارت کا حلف لے رہے ہوں اور ان کی اس تقریب کے ساتھ ٹیلی ویژن پر Ticker چل رہا ہو کہ غزہ کے شہریوں کو اندھا دھند بمباری کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔

غالباً اس کی دوسری وجوہ بھی ہیں۔ مغربی میڈیا میں اسرائیلی حکام کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ایک بات واضح ہے کہ حماس کو مکمل طور پر تباہ کرنے کا ہدف پورا نہیں ہوا۔ اسرائیلی چاہتے تھے کہ حماس کا فوجی، سیاسی ڈھانچہ تباہ ہوجائے اور ان کے میانہ رو مخالف الفتح کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہو۔ ۱۴ر جنوری کو یہ خبر تھی کہ فلسطینی اتھارٹی کے صدر اور الفتح کے رکن محمود عباس اور ان کی پارٹی کا اثر و رسوخ ہر روز کم ہو رہا ہے۔ غزہ پر جتنے بم گرتے ہیں، حماس کی حمایت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔ ۲۰۰۶ء میں حماس کی الیکشن میں مکمل فتح کے بعد سے محمود عباس غزہ میں داخل بھی نہیں ہوسکے ہیں تو وہ اس علاقے میں قائدانہ کردار کیسے ادا کریں گے؟

اسرائیل اور مصر یہ چاہتے ہیں کہ غزہ کی تعمیر نو کے پروگرام میں الفتح پارٹی اور فلسطینی اتھارٹی کا مرکزی کردار ہو۔ کویت میں عرب لیڈروں کی ایک کانفرنس میں سعودی عرب کے شاہ عبداللہ نے مجوزہ عرب فنڈ کے لئے ایک ارب ڈالر کا عطیہ دینے کا اعلان کیا، عرب فنڈ کل دو ارب ڈالر کا ہوگا۔ تعمیر نو کا کیا حشر ہوتا ہے؟ یہ دنیا عراق میں دیکھ چکی ہے۔ ۱۱۸ر ارب ڈالر کے منصوبے میں سو ارب ڈالر ضائع ہوئے۔ ٹھیکیداروں اور سیاستدانوں نے کھالئے یعنی پورے منصوبے کا ۹۰ فیصد ضائع ہوگا۔ اسرائیلیوں نے ۱۹۸۰ء کی افغان جنگ میں ۱۹۶۷ء میں مصر وغیرہ سے سوویت ساخت کا لوٹا ہوا اسلحہ مجاہدین کے سر تھوپ دیا۔ کوئی ہتھیار کام کا نہیں تھا۔ مصری بھی کچھ کم نہیں ہیں اور الفتح کے میانہ رو سیاستداں اسرائیل اور مغربی ملک کی آڑ میں کوئی ٹھوس ترقیاتی کام نہیں ہونے دیں گے یا اتنا ناقص کام کریں گے کہ اس کا نہ ہونا بہتر ہے۔ اگر عراق میں سو ارب ڈالر ضائع ہوگئے تو غزہ کے دو ارب ڈالر کس گنتی میں ہیں؟

ایک اسرائیلی لیفٹنٹ جنرل غبی اشکنازی نے پارلیمنٹ میں کہا کہ حماس کے عمارتی ڈھانچے کو خاصا نقصان پہنچایا گیا ہے۔ ان کی مراد ان عمارتوں سے تھی جہاں حماس کے دفاتر ہیں۔ سو ملین فلسطینیوں کے ۵۰۰۰ مکان بمباری سے تباہ کردیے گئے۔ سابق وزیر اعظم بنجامن نیتن یاہو نے کہا کہ ایک نہ ایک دن حماس کو غزہ سے ہٹانا ہوگا۔ جسوقت انھوں نے بیان دیا تھا ، اسرائیلی بمباری شدید تھی۔ انھوں نے کہا کہ اسرائیل اگر اس جنگ میں یہ مقصد پورا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کی حمایت کریں گے۔ فلسطینیوں میں حماس کا ظہور نسبتاً حالیہ واقعہ ہے جب اسرائیل بنایا گیا تو اس سرزمین پر صرف ۶۱۲۰۰۰ یہودی اور ۱،۲ ملین فلسطینی تھے۔ سیکولر ریاست کے حامی اگر اسی وقت ایک سیکولر ریاست قائم کرتے جہاں یہودی اور مسلمان اور عیسائی فلسطینی اکٹھے میل جول سے رہتے تو یہ قصہ ہی نہ ہوتا لیکن اس وقت

باقی صفحہ ۵ پر

میلادالنبیؐ کا پیغام

محمد نصیرالدین، حیدرآباد

میلادالنبیؐ کی آمد پر مسلمان خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں، بہت سے لوگ مٹھائی اور شیرینی بناتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں۔ سیرت النبیؐ کے ذکر کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں۔ نعتیہ محافل کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حکومت کے سربراہ، سماجی، مذہبی اور سیاسی قائدین بھی پیغامات جاری کرتے ہیں۔ بہت سی جگہوں پر گھروں اور بازاروں میں روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور پھر روزمرہ کی ہماہمی اور زندگی کی بھیڑ بھاڑ میں مسلمان منہمک ہوجاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کا تقاضا کیا اتنا ہی ہے؟ دنیا کے دیگر مذاہب اور پیشواؤں کا بھی لوگ جنم دن مناتے ہیں اور کم وبیش اسی انداز میں مناتے ہیں۔ اس صورتحال سے مسلمانوں اور دیگر عقائد کے ماننے والوں میں کوئی واضح اور بین فرق نظر نہیں آتا۔

دنیا میں بے شمار لوگ آئے اور چلے گئے۔ بعض لوگوں نے عوامی فلاح وبہبود کے کچھ کام انجام دیے، کسی نے انسانی ضروریات کے لئے مختلف چیزیں ایجاد کیں، کسی نے ملک وسماج میں امن اور خوشحالی کے لئے قربانیاں دیں اور کچھ لوگوں نے عوام الناس کی خدمت کے لئے خود کو وقف کردیا۔ ان سب لوگوں کو دنیا والے مختلف انداز سے یاد کرتے ہیں اور ہر سال انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اس سے بڑھ کر کچھ کر بھی نہیں سکتے، اس لئے کہ ان کے کارنامے محدود نوعیت کے تھے اور محدود وقت کے لئے تھے۔ زندگی کے تیز رفتار سفر میں ان کی ایجادوں اور کارناموں کی کوئی افادیت اور اہمیت باقی نہیں رہی بلکہ انھوں نے جو نظریات یا اصول پیش کئے تھے وہ ناقابل عمل ہوچکے ہیں اور اگر آج ان کے اصول ونظریات کی بات کی جائے تو ساری دنیا اس کو ملامت کرے گی۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ، نظریات اور تعلیمات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کو بلاتفریق فرقہ و زبان، علاقہ وملک ایک نظریہ دیا، ایک عقیدہ دیا اور زندگی گزارنے کا ایک اعلیٰ عملی نمونہ پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عظیم الشان کارنامہ پندرہ سو سال قبل بھی منفرد تھا، آج بھی منفرد ہے اور قیامت تک بھی وہ بلاشک وشبہ یکساں قابل عمل اور منفرد حیثیت کا حامل رہے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''تمہارے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔ اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کا خوف رکھتا ہے''۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو ٹوک انداز میں فرمادیا ہے کہ اہل ایمان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عملی نمونہ ہے برخلاف اس کے مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی زندگیوں میں اسوۂ رسولؐ کی اتباع اور پیروی بہت کم نظر آئے گی۔ دنیا کی مادہ پرستانہ، ملحدانہ اور مغربی تہذیب اور طور طریقوں نے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مسلمانوں کا رہن سہن، کسب معاش، معاشرت، معیشت، معاملات و تعلقات خوشی وغم کے مواقع اور دیگر تمام امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات محض رسمی ہوکر رہ گئی ہیں۔ مسلمان ہر مسئلے میں حیلہ حوالہ کرتے ہوئے اپنے من پسند طور طریقوں پر عامل ہیں۔ بدلے زمانے کا حوالہ دینا، سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کا گن گانا اور خود کو ترقی یافتہ بنانے کا جنون اتنا غالب ہوچکا ہے کہ اللہ جل شانہٗ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل آوری کی انہیں توفیق ہی نہیں ہوپاتی۔

ملت اسلامیہ کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ان میں چند لوگ ایسے بھی پیدا ہوگئے ہیں جو حالات وزمانے کے تقاضوں کی دہائی دیتے ہوئے اسلامی تعلیمات پر نظر ثانی کی بات کرنے لگے ہیں۔ انہیں اس بات کا قطعی احساس نہیں ہے کہ ان کی یہ روش انہیں دنیا و آخرت کی رسوائی سے دوچار کرسکتی ہے۔ دوسری طرف دین ومذہب کا نام لینے والوں کی کیفیت بھی کچھ اطمینان بخش نظر نہیں آتی۔ چنانچہ مختلف دینی امور ومعاملات میں وہ خود ساختہ توضیح کرنے لگے ہیں اور دینی اصولوں کو خاموشی سے نظر انداز کرنے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ دین کے نام پر مردوں اور عورتوں کا اختلاط بڑھنے لگا ہے، محرم ونامحرم کی تمیز کا لحاظ ختم ہوتا جارہا ہے۔ زکوٰۃ اور عطیات مال غنیمت بنتے جارہے ہیں۔ بیت المال اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ ایسے افراد دین ومذہب کے نام پر خواہشات نفس کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں۔ شیطانی تہذیب اور تمدن نے انہیں زیر کرلیا ہے۔ دنیا کی عارضی چمک دمک اور عیش وعشرت کے وہ اسیر ہوچکے ہیں اور اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے تعلیمات نبوی ﷺ کی من مانی تشریح اور توضیح کرنے لگے ہیں۔

میلادالنبیؐ کا واقعہ انسانی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ نجات حاصل ہوئی۔ گمراہ انسانیت ہدایت کے نور سے منور ہوئی۔ مظلوم اور محروم طبقات کو انصاف حاصل ہوا۔ عورت کو احترام کی دولت ملی، قتل وغارتگری وخون ریزی کا خاتمہ ہوا، غریبوں، محتاجوں، کمزوروں، بیواؤں اور یتیموں کو سہارا ملا اور دنیا کو ایک مہذب تہذیب وتمدن حاصل ہوا۔ سب سے اہم بات جو مسلمانوں کو میلادالنبیؐ کے موقع پر یاد رکھنی چاہئے یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک انسانیت کے لئے ہادی و رہنما ہیں۔ زندگی گزارنے کا واضح اور مکمل طریقہ آپ نے دکھلا دیا ہے۔ اس میں کسی بھی کمی وبیشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت اور پیروی میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ہدایات سے روگردانی گویا کہ آپ کا انکار ہے اور آپ کا انکار ضلالت وگمراہی اور اخروی ناکامی و نامرادی کا باعث ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں سے منع کیا ہے ان سے رک جانا اور جن باتوں کا حکم دیا ہے ان پر بلا چوں وچرا عمل کرنا ہر مسلمان پر لازم اور فرض ہے۔ مسلمانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا کی ہر شئے سے زیادہ محبت کرنی چاہئے۔ ہر مسلمان کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے کہ وہ اسوۂ رسولؐ پر کتنا عمل پیرا ہے۔ وہ اپنی نجی، خاندانی، معاشرتی ومعاشی زندگی میں اسوۂ رسولؐ پر کتنا عامل ہے۔ ہر مسلمان اپنا جائزہ لے کہ اللہ کی عبادات، باہمی معاملات، تعلقات وروابط اور مکمل شب وروز میں وہ کتنا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور اطاعت کر رہا ہے۔ فی زمانہ عموماً مسلمان حصول رزق میں حلال وحرام، جائز وناجائز کی تمیز کھوچکے ہیں۔ شادی بیاہ ودیگر مواقع پر حدود وقیود سے آزاد نظر آتے ہیں، خواتین پر دہ وحجاب کے اصول سے دور ہوچکی ہیں۔ معاشرہ غض بصر اور اختلاط مرد وزن میں احتیاط کو نظر انداز کرتا جارہا ہے۔ تعلق زن وشو اور ازدواجی زندگی میں نافرمانی بھی عام لگتی ہے۔ ایسے میں ہر مسلمان مرد وعورت کی ذمہ داری ہے کہ اپنی مکمل زندگی کا احتساب کرے اور کھلے دل سے جائزہ لے کہ اتباع سنتؐ میں اس سے کہاں کوتاہی سرزد ہورہی ہے اور اس بات کا عزم وعہد کرے کہ وہ اس کوتاہی کو ترک کردے گا۔

معاشرہ اور سماج میں اجتماعی معاملات کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اسلام نے اجتماعی امور ومعاملات میں بھی انسانیت کی رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ صنعت وتجارت، تعلیم وریسرچ، سیاست وقانون سازی، انتظام مملکت عدل وقانون اجتماعی امور ومعاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور میں بھی مکمل رہنمائی فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے کہ ان شعبہ ہائے زندگی میں کیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جاری ونافذ ہوں؟ انفرادی طور پر اگر وہ سیرت النبیؐ کی اتباع کرلیں تو کافی نہیں ہوگا، انہیں کوشش کرنی ہے کہ جس معاشرے اور سماج میں وہ زندگی گزار رہے ہیں وہاں کے اجتماعی امور ومعاملات بھی

باقی صفحہ ۷ پر

اقتدار کی تبدیلی تمام تر تعصّبات کی نفی ہے

پروفیسر اختر الواسع، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

امریکہ میں صدارتی انتخابات کے نتیجے میں جو تبدیلی آئی ہے وہ ایک فرد اور ایک جماعت تک محدود نہیں ہے۔ دراصل بارک حسین اوبامہ کا انتخاب کئی اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ ابھی تک امریکہ کے اندر رنگ، نسل اور مذہب کو لے کر جو تعصبات پائے جاتے تھے یہ انتخاب ان سب کی نفی کرتا ہے۔ میں امریکی عوام جن میں خاص طور سے سفید فام نوجوانوں کو بے حد اہم اور ذمہ دار سمجھتا ہوں اس تبدیلی کا میں عینی شاہد ہوں کیوں کہ انتخابات کے دوران میرا امریکہ کی مختلف ریاستوں میں جانا ہوں اس لئے مجھے یہ بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اس اعتبار سے بھی دیکھیں کہ اوبامہ نے یہ کہا ہے کہ ہم عراق سے فوج واپس بلائیں گے، ایران سے غیر مشروط گفتگو کریں گے۔ یہ اتنی اہم بات ہے کہ جس سے یہ پتہ چلا کہ امریکہ کے عوام بش انتظامیہ کی ان پالیسیوں سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ان پر ایک طرح سے ان کی جیت اوبامہ کی تائید ہی نہیں بلکہ ان پالیسیوں پر خط تنسیخ کھینچنا بھی ہے میں اس اعتبار سے اس کو بے حد اہم مانتا ہوں اور یہ تو بالکل اپنی جگہ صحیح ہے کہ وہ تبدیلی جو ابراہم لنکن نے ۲۰۰ سال قبل شروع کی تھی۔ غلامی کے خلاف اور ۱۹۶۳ء میں لنکن میموریل پر واشنگٹن ہی میں جس کو ایک خواب کی صورت میں مارٹن لوتھر نے دیکھا تھا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا ہے اور ابراہم لنکن نے جس تبدیلی کا آغاز کیا تھا۔ وہ ایک اٹوٹ سچائی کے طور پر ہمارے سامنے آئی ہے۔ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ آج کی دنیا بڑے ممالک ہیں وہ اپنے مفادات کو پیش نظر رکھ کر دنیا کے فیصلے کرتے ہیں۔ ہمیں خیال رہے کہ وہ اپنا نقصان کر کے دوسروں کا فائدہ کرنے کے صوفیانہ مسلک کے قائل نہیں ہوتے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بش انتظامیہ اور اوبامہ کی زبان میں فرق ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اوبامہ نے گوانتانامو بے جیل بند کرنے کا حکم دیا میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ابھی شروعات سے ہی کسی کے بارے میں منفی سوچ نہیں بنالینا چاہئے۔ ان کے سامنے چیلنجز بہت اہم ہیں۔ داخلی سطح پر اپنے ملک کی معیشت کو سنبھالنا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کی پوری بنیاد صارفین کے کلچر پر ہے۔ جہاں پر سودی نظام نے نئے نئے انداز سے امریکی عوام کا خون چوس کر کھوکھلا کیا ہے انہیں اس کو پٹری پر لانا ہے۔ دوسرا بڑا مسئلہ عراق اور افغانستان سے امریکہ کی باعزت واپسی کا ہے تیسری بات دنیا میں امریکہ کی خراب شبیہ کو درست کرنے کا ہے جو بش کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور اس وقت دنیا میں امریکہ حلیف کے طور پر نہیں بلکہ حریف تسلیم کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ ہوگا کہ کیا فلسطینیوں سے کئے گئے وعدے اوسلو سے لے کر کیمپ ڈیوڈ تک ان پر عمل درآمد ہوگا یا نہیں فلسطینیوں کو ان کا کھویا ہوا حق واپس ملے گا یا نہیں اس کے علاوہ چینی معیشت کا دنیا پر اثر اور روس کے بدلتے ہوئے تیور بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

جہاں تک امریکہ ہندوستان تعلقات کی بات ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی حکومت اس طرح کا کوئی کام نہیں کرے گی کہ وہ چین کی حریف بن جائے۔ اس خطے میں کوئی عدم استحکام نہ ہو اس میں ہماری بھی عافیت ہے اگر گزشتہ ساٹھ برس کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو پاکستان اور ہندوستان میں بنیادی فرق یہی ہے ہم امریکہ سے دوستی کرتے ہیں لیکن اپنے دوستوں کی شرطوں پر نہیں اپنے پڑوسیوں کی قیمت پر نہیں ہم ایک حد تک جاتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ چین سے مقابلہ امریکہ سے کہیں زیادہ ہمارا ہے۔ آج معیشت جس کی بنیاد مسابقت پر ہے ایسی صورت میں بھارت پہلے اپنی فکر کرے گا۔ امریکہ اور بھارت کے تعلقات مختلف نشیب وفراز سے گزرے ہیں لیکن ہندوستان نے کبھی بھی اپنی خارجہ پالیسی اور سالمیت کو متاثر نہیں ہونے دیا ہے۔ جب کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی امریکہ سے بری طرح متاثر ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ پاکستان کے حکمراں پاکستان کے مفادات کی نگرانی کرنے کے بجائے امریکی مفادات کی نگرانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں ایران اگر پرامن مقاصد اور اپنی توانائی ضرورتوں کے لئے ایٹمی تجربات کرتا ہے تو یہ حق اسے ہونا چاہئے۔ اگر اسرائیل کو یہ حق ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیار بنانے اور اس سے متعلق ہر طرح کی سرگرمی میں ملوث رہے تو دوسرے ملکوں کو یہ حق حاصل کیوں نہ ہو۔ (گفتگو اشرف بستوی)

اقتدار کی تبدیلی سے نرمی گرمی آتی رہتی ہے لیکن اہداف نہیں بدلتے

احمد جاوید، ایڈیٹر ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی

امریکہ میں اقتدار کی تبدیلی اور بارک حسین اوبامہ کی صدارت پر متضاد توقعات کے اظہار اور نت نئی قیاس آرائیوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک دنیا اوبامہ کو اچھی طرح جان نہ لے۔ جس شخص کو دنیا بہت اچھی طرح نہیں جانتی اس کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک شخص جس کا افریقہ کے ایک مسلم خاندان سے تعلق ہے جس کی پرورش وپرداخت کنساس کے ایک کیتھولک عیسائی خاندان میں ہوئی اور جو خود ایک راسخ العقیدہ کیتھولک عیسائی کی حیثیت سے شکاگو کے جنوبی علاقے میں ایک عرصہ تک مقامی چرچ کی تنظیم کے کمیونٹی آرگنائزر کی خدمات انجام دے چکا ہے۔ پھر اس کے یہودیوں سے بھی اتنے ہی قریبی رشتے ہیں جن کا ثبوت راہم ایمانوئیل کو وہائٹ ہاؤس کا چیف آف اسٹاف مقرر کیا جانا ہے۔ آخر اس شخص سے ہر طبقہ گوناگوں امیدیں اور متنوع توقعات کیوں نہ وابستہ کرے۔ ویسے بھی امریکہ میں کسی سیاہ فام شخص کا صدر منتخب ہوجانا کوئی معمولی انقلاب نہیں۔ لیکن گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو یہ امریکہ کی گوری تاریخ کے ماتھے پر نظر کا ٹیکہ ہے۔ بالفاظ دیگر ایک کاسمیٹک تبدیلی۔

وہائٹ ہاؤس دراصل ایک مستحکم نظام کا حصہ ہے اور کسی بھی نظام میں ایک فرد کی حیثیت کیا ہوتی ہے چاہے وہ اس نظام کا سربراہ ہی کیوں نہ ہو کسی ذی شعور شخص سے مخفی نہیں ہوسکتا۔ یہ خیال غلط نہیں ہے کہ صدر تبدیل ہونے سے امریکہ کی خارجہ پالیسی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی ایک مسلسل اور مربوط عمل ہے جس کی سمت ورفتار امریکی تھنک ٹینکس، سینیٹ اور کانگریس اور ان کی متعلقہ کمیٹیاں طے کرتی ہیں۔ وہائٹ ہاؤس کا رول اس میں یقیناً بہت ہی اہم ہوتا ہے اور صدر کی کابینہ وزارت خارجہ، محکمہ دفاع (پنٹاگون) اور خفیہ ایجنسیوں کی مدد سے پالیسیوں کے نفاذ کی صورت گری کرتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو اقتدار کی تبدیلی کے ساتھ نرمی گرمی آتی رہی ہے لیکن اہداف نہیں بدلتے۔ جب تک پورا نظام تبدیلی پر آمادہ نہ ہو اور اہداف نہ بدل جائیں۔ ایسی تبدیلی کو آپ جو چاہیں نام دے سکتے ہیں لیکن اس سے نئی امیدیں وابستہ کرنا فضول ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام امریکیوں میں تبدیلی کی بڑی زبردست خواہش موجزن ہے۔ اوبامہ کا انتخاب اسی خواہش کا اظہار ہے لیکن تبدیلی صرف خواہش یا اس کے اظہار سے نہیں آتی اس نظام کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہے وہ کتنی تبدیلی قبول کرتے ہیں، یہ دیکھنا زیادہ اہم ہوگا۔ جہاں تک بھارت امریکہ تعلقات کا سوال ہے تو اس میں ابھی اور بھی گرمجوشی آئے گی۔ کیونکہ بھارت کی قومی سیاست کے دونوں دھڑے (یو پی اے اور این ڈی اے) اس معاملے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں، جو تھوڑی بہت مزاحمت ہے وہ بائیں بازو کی جماعتوں کی جانب سے ہے جو ملک کی خارجہ پالیسی پر اثر انداز نہیں رہ گئی ہیں۔ فوجی تزویراتی اشتراک کا معاہدہ اور جوہری تعاون کا سودا کر کے بھارت امریکہ کے ساتھ ایک ایسے رشتے میں بندھ گیا ہے جو ان دونوں کو اس وقت تک ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونے دے گا جب تک کہ یہ امریکہ نہ چاہے اور اس وقت امریکہ کیا چاہتا ہے اس کا واضح اشارہ پاکستان سے امریکہ کی بڑھتی تلخی میں موجود ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جنوبی ایشیا میں امریکی سیاست کا محور بدل چکا ہے۔ اب یہ بھارت پر ہے کہ وہ اس سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ سمجھنا سادہ لوحی ہوگی کہ امریکہ ہمارا بے لوث دوست ہے۔ سیاسی رشتے مفادات پر مبنی ہوتے ہیں۔ بلاشبہ امریکہ ہندوستان کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے اس لئے ہمیں اس راہ میں ہر قدم پھونک کر اٹھانا چاہئے۔ اگر وہ بھارت کو چین کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے لیکن یہ فیصلہ خود بھارت کو کرنا ہے کہ اس کے حق میں کیا مضر ہے اور کیا مفید۔

اوبامہ کے سامنے سب سے بڑا چیلنج امریکہ کو موجودہ مالی بحران سے نکالنا ہے دوسرا چیلنج ہے عراق اور افغانستان پر امریکی تسلط قائم رکھتے ہوئے وہاں امن کی بحالی اور باعزت طریقے سے اپنی فوجوں کا انخلاء۔ تیسرا چیلنج عرب اسرائیل تنازعہ کا حل جو ہر امریکی صدر کی خواہش ہوتی ہے۔ ان کے پیش رو ڈیموکریٹ صدر بل کلنٹن نے مرحوم یاسر عرفات کو مسئلہ فلسطین کے حل کا ایک فارمولہ پیش کیا تھا جس کو انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ اب اوبامہ کی حکومت میں کلنٹن کی اہلیہ ہلیری وزیر خارجہ ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس فارمولہ کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ اسرائیل نے غزہ پٹی میں وحشیانہ فوجی کارروائی کر کے اسی کے لئے ماحول سازی کی کوشش کی ہے تاکہ فلسطینی ہمت ہار دیں اور آسانی سے امریکی پیش کش قبول کریں۔

جہاں تک عالم اسلام میں امریکہ کی خراب شبیہ کا تعلق ہے تو وہ اتنی آسانی سے تبدیل نہیں ہوسکتی کہ کسی سیاہ فام کو آپ نے اپنا صدر منتخب کرلیا جس کا نام بارک حسین اوبامہ ہے۔ جب تک کہ وہ عملی اقدامات سے یہ ثابت نہ کرے کہ امریکہ واقعی اسلام کے خلاف کوئی صلیبی جنگ نہیں لڑ رہا ہے جس کا آغاز بش باپ بیٹوں نے کیا تھا اور اس طرح وہ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا اندھا حمایتی نہیں ہے اور یہ ثابت کرنا اوبامہ کے لئے آسان نہیں ہوگا۔ عالم اسلام بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں اور دوسرے لوگوں میں اوبامہ کی صدارتی جیت پر جو خوشی نظر آئی اس کو امریکہ کی شبیہ میں تبدیلی تصور کرنا غلط ہوگا، وہ صرف بش کی شکست اور ایک سیاہ فام شخص کے صدر امریکہ بن جانے کی خوشی تھی جو لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ رہے گی لیکن یہ واقعہ امریکہ کے گناہوں کا کفارہ ہرگز نہیں بن سکتا۔

> جہاں تک عالم اسلام میں امریکہ کی خراب شبیہ کا تعلق ہے تو وہ اتنی آسانی سے تبدیل نہیں ہوسکتی کہ کسی سیاہ فام کو آپ نے اپنا صدر منتخب کرلیا جس کا نام بارک حسین اوبامہ ہے۔ جب تک کہ وہ عملی اقدامات سے یہ ثابت نہ کرے کہ امریکہ واقعی اسلام کے خلاف کوئی صلیبی جنگ نہیں لڑ رہا ہے جس کا آغاز بش باپ بیٹوں نے کیا تھا اور اس طرح وہ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا اندھا حمایتی نہیں ہے اور یہ ثابت کرنا اوبامہ کے لئے آسان نہیں ہوگا۔

اوبامہ کے اندر بظاہر متضاد ومتصادم حقیقتوں کو مدغم کرنے اور انہیں مربوط بنانے کی بے پناہ صلاحیت ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ انتخاب میں ان کی تاریخی کامیابی کا راز بھی یہی تھا۔ اسی کی بدولت وہ ہر طبقہ کو اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہوئے۔ بقول شخصے یہ اس تجربہ کا کمال ہے کہ آپ کا تعلق ایک ایسے گھر سے ہے جہاں سفید فام لوگ آپ کی پرورش وپرداخت کرتے ہیں اور جب آپ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو دنیا آپ کو سیاہ فام سمجھتی ہے۔ غور کیجئے کہ جب ساری دنیا میں تہذیبوں کے تصادم کے فلسفہ کو فروغ دیا جا رہا تھا تو قدرت کے کارخانے میں اس گمراہ کن نظریہ اور اس زہریلی سوچ کا ایک منہ توڑ جواب تیار ہو رہا تھا۔ اوبامہ کی شخصیت میں بیک وقت کئی مختلف تہذیبیں سانس لے رہی ہیں، اس کی ابتدائی زندگی کا تشکیلی دور مشرق بعید کے ایک ایسے ملک میں گزرا جہاں دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی ہے لیکن جہاں قدم قدم پر آپ کا سامنا ہندو اساطیر کے کرداروں سے ہوتا ہے۔ رامائن اور مہابھارت جہاں کی فصل میں رچی بسی ہوئی ہے۔ چار سال تک انڈونیشیا میں رہنے کے باعث اوبامہ رام لکشمن، سیتا اور ہنومان کو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا مریم اور عیسیٰ سے آگاہ ہیں۔ خود عیسائی ہیں لیکن یہودیوں سے ایسی قربت کہ وہ انہیں اپنا آدمی تصور کرتے ہیں۔ ایک ایسا شخص کسی سپر پاور ملک کے سربراہ کی حیثیت سے دنیا میں نفرتوں کی خلیجیں پاٹنے اور قوموں کے درمیان ٹکراؤ دور کرنے میں اس وقت موثر کردار ادا کر سکتا ہے، لیکن یہ اس پر منحصر ہے کہ امریکی اسٹبلشمنٹ اس پیغام کو سمجھے ورنہ وہائٹ ہاؤس میں اوبامہ کی شخصیت اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جتنا مجسمہ آزادی سے واشنگٹن کی زینت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(سوالات پر مبنی)

مسائل پر قابو پانا آسان نہ ہوگا

ظفر آغا، سینئر صحافی، دہلی

ایک ایسے شخص کا جس کے ساتھ اسلامی نام کی کنیت جڑی ہو امریکہ کے اقتدار میں اعلیٰ عہدے پر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ امریکی معاشرے میں بے انتہا خلفشار ہے۔ امریکہ کے صدارتی انتخاب کے دوران دو باتیں بہت ابھر کر آئیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ صدر بش کو امریکہ کے ۸۰ فیصد سے زیادہ عوام نے مسترد کر دیا اور دوسرا بڑا انقلاب یہ ہوا کہ صرف سفید فام قوم کا اقتدار پر قبضہ ختم ہوا اور امریکہ کی کرسی صدارت پر ایک سیاہ فام شخص فائز ہوا۔ جہاں تک عالمی سطح پر اس تبدیلی کے اثرات کی بات ہے بارک اوباما کے آنے سے ساری دنیا کے دبے کچلے عوام میں اعتماد کی لہر دوڑ گئی ہے ان میں یہ امید پیدا ہوئی ہے کہ وہ بھی ایک کالے امریکی کی طرح اگر موقع ملے تو صحیح معنوں میں جمہوری نظام جن ملکوں میں نافذ ہے اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے صدر کی پالیسیوں کو رد کر دیا تھا کیوں کہ انہوں نے دوران انتخاب یہ کہا تھا کہ وہ عراق سے اپنی فوجیں ہٹا لیں گے۔ مسلم دنیا سے اپنے رشتے استوار کریں گے اس سے یہ امید جگی کہ امریکہ نے جو اعلان جنگ کر رکھا تھا اب اس پر روک لگے گی اور دنیا امن وامان کی جانب گامزن ہوگی۔ اس وقت صدر اوباما کے سامنے امریکہ کی سطح پر معاشی بحران کا سامنا ہے۔ اس وقت امریکہ کی بدحال معیشت ہے کہ دنیا میں سب سے طاقتور ملک اور سب سے بڑی معیشت ہونے کے باوجود لوگ فاقہ کشی پر مجبور ہیں۔ اب تک تیس لاکھ لوگ بے روزگار ہو چکے ہیں۔ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اخباری رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام امریکی بالکل بدحال ہو گئے ہیں۔ الغرض یہ کہ امریکہ اس وقت سخت معاشی بحران کا شکار ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت اوباما کے لئے امریکہ کی سطح پر سب سے بڑا چیلنج امریکی معیشت کو پٹری پر لانا ہے۔ انہوں نے عالمی سطح پر اپنے تعلقات بہتر بنانے کی بھی بات کہی ہے۔ گزشتہ آٹھ برسوں میں بش انتظامیہ نے امریکہ کی شبیہ عالمی پیمانے پر جو خراب کی ہے اسے بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے مشرق وسطیٰ میں اپنا خصوصی ایلچی تعینات کیا ہے تاکہ وہ مسلم حکمرانوں سے یہ پوچھے کہ انہیں امریکہ سے کس بات کی شکایت ہے۔ فی الحال عالمی پیمانے پر عراق اور افغانستان دو بہت سنگین مسئلے ہیں امریکہ کی گزشتہ ۶۰ برس کی یہ پالیسی کو چار سال میں بدل دینا اور معاشی بحران کو چار برسوں میں حل کر لینا عراق اور افغانستان مسئلے پر قابو پالینا اوباما کے لئے آسان نہیں ہے۔ چار سال ان مسائل کے حل کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ جہاں تک بھارت امریکہ تعلقات کی بات ہے تو ان کے رُخ سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ بھارت سے بہتر تعلقات کے خواہاں ہیں۔ وہ یہ بھی چاہیں گے کہ ہندوستان کی فوجیں افغانستان میں امریکی فوجوں کے شانہ بشانہ لڑیں لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان اس بات کے لئے تیار ہوتا ہے کہ نہیں۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ امریکہ نے جس کا ہاتھ پکڑا وہ دنیا میں ڈوبا۔ پاکستان کی آج جو حالت ہے وہ امریکہ دوستی کی وجہ سے ہی ہے۔ گزشتہ ساٹھ برس سے پاکستان امریکہ کا آلہ کار بنا رہا آج عالم یہ ہے کہ وہ ایک پسماندہ ملک بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارا ملک چاہے لاکھ اس بات کی تشہیر کرے کہ بھارت امریکہ دوستی سے بھارت کو فائدہ ہوگا لیکن صحیح نہیں ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ امریکہ جس سے دوستی کرتا ہے اس میں فائدہ کم نقصان زیادہ ہوا ہے۔ امریکہ کی یہ کوشش ضرور ہوگی کہ وہ بھارت سے چین پر نظر رکھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بھارت ایسا کرنے دے گا اور اگر ایسا ہوا تو بھارت کے حق میں بے حد نقصان دہ ہوگا کیوں کہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ چین کی سرحدیں بھارت سے بہت دور تک ملتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کی دنیا میں امریکہ بڑی طاقت ہے اس سے کوئی بھی ملک اپنے تعلقات خراب کر کے رہنا مناسب نہیں سمجھے گا لیکن ہندوستان کے نظام کو یہ سمجھنا ہوگا کہ ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کو ٹھیس نہ پہنچے۔ دنیا نے یہ دیکھا ہے کہ امریکہ نے جس سے بھی دوستی کی ہے اس کی خود مختاری پر آنچ آئی ہے۔ اس لئے ہندوستان بھی تعلقات خراب نہیں کر سکتا ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بھارت کو بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہئے۔ (گفتگو پر مبنی)

نئے صدر کی سنجیدہ مزاجی کے باوجود انقلابی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے

ساجد رشید، معروف صحافی، ممبئی

جارج ڈبلیو بش کا اقتدار سے جانا اور اوبامہ کا برسر اقتدار ہونا کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں اس تبدیلی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دیکھنا ہوگا۔ ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف پوری دنیا پر اس کے اثرات۔ میرے خیال میں بش کا جانا اس دنیا کے لئے بہت ضروری تھا جو کسی بھی طرح کے جبر اور دباؤ کے خلاف ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ بش ایک طرح سے پوری دنیا پر اپنی آمریت قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ دنیا کے لئے ایک خطرہ تھے انہوں نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک حصہ وہ تھا جو ان کا حلیف تھا دوسرے وہ ممالک جو ان کے ساتھ نہیں تھے اسی طرح ان کے پوچھنے کا ڈھنگ بہت خطرناک تھا کیوں کہ یہ طریقہ تو غیر جمہوری ملکوں میں اپنایا جاتا ہے۔ جس کی قیمت امریکہ کو افغانستان میں بڑی حد تک چکانی پڑی۔

لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بش امریکہ کے لئے سب سے بہتر صدر ثابت ہوئے ہیں بھارت امریکہ ایٹمی معاہدہ جسے کسی بھی امریکی صدر نے کرنے کی ہمت نہیں کی بش نے سب سے پہلے CTBT معاہدہ کو انجام دیا۔ بعدازیں ایٹمی معاہدہ انجام پذیر ہوا یہ الگ بحث ہے کہ یہ معاہدہ بھارت کے حق میں کتنا فائدہ مند ثابت ہوگا اور امریکہ اس سے کیا فائدہ اٹھائے گا۔ ہم دیکھیں کہ بش نے بہت سارے معاملات میں ہندوستان کے ہی رُخ کی حمایت کی۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کہ ڈیموکریٹ کو ہم لوگ لبرل مانتے ہیں اور ریپبلکن کو تو ہم لوگ کسی حد تک رجعت پسند کہتے ہیں لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ اب تک امریکہ کے جتنے بھی ڈیموکریٹ صدور ہوئے ہیں ان کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات بہت سطحی رہے ہیں۔ جارج ایف کنیڈی سے بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے تعلقات بہت گہرے ہوئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ بھارت روس سے کچھ دوری بنالے گا یا کچھ توازن برقرار رکھے گا لیکن چین سے جب ہماری لڑائی ہوئی تو کینیڈی نے کوئی مدد نہیں کی۔ ۱۹۷۸ء میں مرارجی ڈیسائی نے جب ملک میں نیوکلیئر پروجیکٹ شروع کرنے کی بات کی تو انہوں نے بہت سخت موقف اختیار کیا تھا بلکہ کلنٹن بھی ڈیموکریٹک تھے ان کے دور میں ملک کی این ڈی اے حکومت نے جب نیوکلیئر دھماکہ کیا تو انہوں نے بھی سخت موقف اختیار کیا اور پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہم ریپبلکن کے دور پر نظر ڈالتے ہیں کچھ اسی طرح کا معاملہ ظاہر ہوتا ہے آئزن آور پہلے امریکی صدر تھے۔ ۱۹۵۹ء میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا انہوں نے بھارت سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی تھی۔ رونالڈ ریگن نے ان رکاوٹوں کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی جو جمی کارٹر نے پیدا کر دی تھیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ ریگن ہی تھے جنہوں نے دنیا میں جنگجو طاقتوں کو جنم دیا جس کی قیمت اب پورے ایشیا کو چکانی پڑ رہی ہے لیکن انہوں نے ہندوستان کے ساتھ رشتوں کو بہتر بنایا۔ ریپبلکن میں صرف نکسن ایسے صدر تھے جن سے ہندوستان کی کبھی نہیں جمی اس کی اصل وجہ یہ تھی کی اس وقت اندرا گاندھی وزیر اعظم تھیں اور انہوں نے ہندوستان کی خودداری کے ساتھ کوئی سودا نہیں کیا۔ بش سینئر سے بھی تعلقات بڑی حد تک ٹھیک رہے لیکن بش جونیئر کے ساتھ تعلقات میں مضبوطی آئی۔

جہاں تک اوباما کا تعلق ہے یہ بات یاد رہے کہ وہ بہت پیچیدہ شخصیت کے مالک ہیں آپ اوباما کو صرف کالے اور گورے کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ سب سے پہلی بات کہ وہ سب سے پہلے کالے امریکی صدر ہیں۔ وہ کسی بڑے سیاسی گھرانے کے چشم وچراغ نہیں ہیں۔ ان کے والد مسلمان تھے۔ انہوں نے بہت نچلی سطح سے اوپر تک کا سفر کیا ہے۔ ایسا وہ شخص ہوسکتا ہے جس میں غیر معمولی صلاحیت موجود ہو۔ ان کی غیر معمولی صلاحیت ان کے مزاج کا ٹھنڈا پن ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی بات کہتے ہیں انہوں نے شروع میں یہ ضرور کہا تھا کہ یہ جو دہشت گردی ہے اس سے لڑنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم دوسری چیزوں پر بھی توجہ دیں۔ بھارت پاک تعلقات بحال ہوں اور کشمیر مسئلے حل کر دیا جائے تاکہ پاکستان اپنی زیادہ توجہ دہشت گردی کے خلاف کر سکے۔ لیکن ہندوستان نے اس بات سے ناخوشی کا اظہار کیا تو انہوں نے صاف کہا کہ امریکہ کی ایسی کوئی نیت نہیں ہے کہ وہ کسی کے داخلی معاملات میں دخل دے۔ وہ بہت سلجھے ہوئے ڈھنگ سے چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا دہشت گردی سے گزر رہی ہے اور شرمناک بات ہے کہ اسے اسلامی دہشت گردی کا نام دے دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دہشت گردی کے معاملے پر اوبامہ کا رویہ بش سے کہیں زیادہ سخت ہوگا۔ لیکن وہ بش کی طرح حملہ آور نہیں ہوں گے بلکہ حکمت عملی سے اسے ڈیل کریں گے جس طرح انہوں نے ابھی پاکستان کے ساتھ کیا کہ امداد میں زبردست کٹوتی کر دی اس طریقے سے وہ معاملات پر قابو پانے کی کوشش کریں گے۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس پر تین طرح کی حکومت قائم ہے۔ اوّل وہاں کے سیاست داں جو بے حد بدعنوان ہیں۔ وہاں کی فوج اور وہاں کی آئی ایس آئی وہاں کے عوام ان تینوں کے نیچے پستے ہیں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اوبامہ کا پاکستان کو دیکھنے کا نظریہ کچھ ایسا ہی ہوگا کہ وہ پاکستان کی فوج اور سیاست دانوں کو اشارہ دیں گے۔

ہندوستان کی سرزمین امریکہ کے لئے اس لئے بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ بھارت ایشیائی ملکوں میں اہم رول ادا کرتا ہے اور دن بدن طاقتور ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے اگر امریکہ اس خطے میں کسی کو سبق سکھانا چاہے گا تو بھارت کا استعمال اس کے لئے زیادہ مناسب ہوگا۔ پاکستان کے حوالے سے ایک بات یہ ظاہر ہو رہی ہے کہ اس کا مستقبل بہت محفوظ نہیں ہے، وہ دن بدن تباہ حالی کی طرف جا رہا ہے، وہاں پر خانہ جنگی تک کے امکانات پیدا ہوسکتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بھارت امریکہ کے لئے اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ بھارت کے پاس ایک بڑا بازار ہے۔ امریکہ نے یہ طے کیا ہے کہ تقریباً ۴۱ ارب ڈالر کا کاروبار کریں گے۔ اس کے برخلاف پاکستان کو تو انہیں دینا پڑتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ بھارت امریکہ کس حد تک تعلقات قائم کرتے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنی آزادی اور خود مختاری سے کسی صورت میں کوئی سمجھوتہ نہ کریں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہماری سب سے عمدہ خارجہ پالیسی پنڈت جواہر لعل نہرو کی اپنائی گئی پالیسی ہے جس نے ہماری خود داری پر کبھی آنچ نہیں آنے دی ہم نے ہمیشہ خود کو کمزور اور پسماندہ ملکوں سے وابستہ رکھا۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے دفاعی اور معاشی معاملات میں کسی کا حکم نہ مانیں لیکن اس بات کے قوی امکان ہیں کہ امریکہ ہمارے ان معاملات میں بڑی حد تک مداخلت کرنے کی کوشش کرے گا۔ خواہ اوبامہ بہت اعتدال پسند نظر آئیں اس لئے کہ وہ بھی اسی نظام کے پاسبان ہیں جو اب تک جارج بش کے ہاتھوں میں تھا۔

> ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے دفاعی اور معاشی معاملات میں کسی کا حکم نہ مانیں لیکن اس بات کے قوی امکان ہیں کہ امریکہ ہمارے ان معاملات میں بڑی حد تک مداخلت کرنے کی کوشش کرے گا۔ خواہ اوبامہ بہت اعتدال پسند نظر آئیں اس لئے کہ وہ بھی اسی نظام کے پاسبان ہیں جو اب تک جارج بش کے ہاتھوں میں تھا۔

مجھے تو لگتا ہے کہ معاشی سطح پر ابھی سے یہ گڑبڑ شروع ہوگئی ہے۔ اگر معاشی میدان میں امریکہ پر انحصار بڑھے گا تو مستقبل میں ہمیں خطرہ ہوگا۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ہم کون سا راستہ اختیار کریں۔ جہاں تک نیوکلیئر معاہدے کی بات ہے تو اس میں اس بات کا امکان ہے کہ جب وہ بھارت سے ناخوش ہوں گے تو یہ معاہدہ خود بخود کالعدم ہوجائے گا لیکن اس وقت امریکہ کے پاس کچھ کھونے کے لئے نہیں ہوگا لیکن ہمارا تو بڑا نقصان ہوجائے گا۔ ہم اس ممکنہ خطرے سے کیسے نکل پائیں گے یہ دیکھنا بے حد ضروری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ امریکہ پاکستان افغانستان اور چین کو سامنے رکھ کر بھارت سے تعلقات مضبوط کر رہا ہے یہ کوئی قیاس نہیں بلکہ سچائی ہے کہ بھارت امریکہ تعلقات کے درمیان چین ضرور ہے امریکہ یہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اگر معاشی بنیاد پر کوئی چیلنجز امریکہ کو ہے تو صرف چین ہی ہے دنیا میں کھلے بازار کا سب سے زیادہ فائدہ چین کو ہی ہوا ہے امریکہ چین کو ایک خطرہ مان کر ہی چلتا ہے۔

(گفتگو پر مبنی)

فکر معاصر

کامیاب کون؟

فلسطین، لبنان، افغانستان اور عراق کو کوئی 'ناکام' اس لئے کہہ سکتا ہے کہ وہ انتہا درجے کی بدحالی، بے بسی اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن کیا اسرائیل، امریکہ، ناٹو ممالک اور صہیونی مقتدرہ کے دیگر حلیف بھی حقیقی معنی میں کامیاب ہیں؟ اسرائیل ساٹھ برس بعد بھی امن اور سکون نہیں خرید سکا۔ وہ اپنے عزائم کے مطابق غیر منقسم یروشلم (بیت المقدس) کو اپنی راجدھانی نہیں بنا سکا۔ وہ ایک دبی کچلی ہوئی قوم کے بچوں کو اپنے ٹینکوں پر پتھراؤ کرنے سے نہیں روک سکا۔ ناقابل تصور فوجی طاقت رکھنے کے باوجود نہ صرف حزب اللہ اور حماس کو پیدا ہونے سے نہیں روک سکا بلکہ براہ راست جنگی مقابلے میں انہیں نابود بھی نہیں کرسکا۔ امریکہ نے سات سال قبل 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' یہ کہہ کر شروع کی تھی کہ وہ 'دہشت گردی کی جڑوں' کو صاف کرکے پوری دنیا کو محفوظ بنا دے گا؟ لیکن تیس لاکھ افراد کو ہلاک کرنے اور دو ملکوں کو موجودہ معاشی ترقی کے معیارات کے اعتبار سے پتھر کے زمانے میں پہنچا دینے کے باوجود دہشت گردی کی جڑوں کو تو درکنار، وہ اس کی شاخوں کا صفایا بھی نہ کرسکا اور نئی امریکی انتظامیہ نے اس عہد کے ساتھ حلف اٹھایا کہ خواہ انہیں پاکستان ہی پر کیوں نہ بمباری کرنا پڑے، لیکن افغانستان سمیت پورے خطے سے وہ اس مرتبہ دہشت گردی کا صفایا کرکے ہی رہیں گے۔ سات سال پہلے امریکہ نے ایک دعویٰ اور کیا تھا کہ وہ افغانستان، عراق اور فلسطین میں جمہوریت کو فروغ دیں گے اور انہیں خطۂ فساد کے بجائے خطۂ امن بنا دیں گے۔ لیکن آج ۲۰۰۹ء میں کسی خوردبین کے بغیر اس حقیقت کا مشاہدہ ننگی آنکھوں سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اسرائیل، امریکہ، ناٹو اور صہیونی مقتدرہ کے سارے دعوے کھوکھلے ثابت ہوئے ہیں اور وہ اپنے متعدد اہداف میں سے کوئی ایک ہدف بھی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ ناٹو ممالک کی فوجیں خود ہی مذاق اڑانے کے طور پر اپنے کٹھ پتلی افغان صدر حامد کرزئی کو 'کابل کا میئر' (Mayor of Kabul) کہہ کر پکارتی تھیں، لیکن اب ۱۸۵۷ء کے بہادر شاہ ظفر کی طرح حامد کرزئی کی حکومت صرف اپنے محل تک محدود ہوکر رہ گئی ہے یعنی اب وہ کابل کے میئر بھی نہیں رہے؟ امریکہ نے افغانستان میں مبینہ القاعدہ اور طالبان کے خلاف جنگ چھیڑی تھی لیکن گوانتاناموبے جیل کو درجنوں ملکوں کے سیکڑوں بے گناہوں سے بھر دینے اور انہیں غیر انسانی مظالم کا شکار بنانے کے باوجود وہ مبینہ القاعدہ کی قیادت کو پاسکے نہ طالبان کی قیادت کو۔ خود یورپی اور امریکی ماہرین کا کہنا ہے کہ طالبان ساٹھ فیصد افغانستان پر پوری طرح قابض ہیں اور بیس فیصد پر ان کا جزوی قبضہ ہے۔ ناٹو کی عملداری محض بیس فیصد شہری Enclave تک محدود ہے اور عراق و افغانستان دونوں جگہ سات سال بعد بھی امریکہ کے خلاف مزاحمت بدستور جاری ہے۔ جنوری ۲۰۰۹ء میں بھی عراق میں چار اور افغانستان میں بارہ امریکی فوجی مزاحمت کاروں کے ہاتھوں ہلاک کئے جاچکے ہیں اور اس سے زیادہ یعنی چوبیس امریکی فوجیوں نے صرف جنوری ۲۰۰۹ء میں خودکشی کی ہے۔ صرف ۲۰۰۸ء میں خودکشی کرنے والے امریکی فوجیوں کی تعداد ایک سو اٹھائیس ہے اور یہ خودکشی کرنے والے فوجی وہی ہیں جو عراق یا افغانستان کے جنگی مورچوں سے واپس آئے ہیں۔ دوسری طرف امریکہ سمیت پوری مغربی دنیا بدترین معاشی بحران اور مندی کا شکار ہے لیکن وہ کون ملک ہیں جو امریکہ، اسرائیل یعنی صہیونی مقتدرہ کے ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچانے میں لگے ہوئے ہیں؟ یہ سعودی عرب اور کویت سمیت گیارہ مسلم ممالک اور چین ہیں۔ امریکہ میں صرف عرب ممالک کی مسلسل اور مستقل سرمایہ کاری کئی ہزار ارب ڈالر سے زائد ہے۔

(اردو ٹائمز، ممبئی)

غزہ سے مصر تک......زیر زمین کاروباری راستے

شہریار

اسرائیل کی غزہ پر موجودہ جارحیت کی ایک وجہ ان سرنگوں کو قرار دیا جاتا ہے جو فلسطینیوں نے غذائی بحران ختم کرنے کے لئے مصر تک کھود رکھی ہیں۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ ان سرنگوں کے ذریعے حماس غزہ میں اسلحہ پہنچاتی ہے۔

اسرائیلی فوج کی طرف سے غزہ کے محاصرے کے بعد فلسطینیوں کو سخت مشکلات کا سامنا ہے۔ تاہم انسان زندہ رہنے کے لئے مشکل سے مشکل کام بھی کر گزرتا ہے۔ اس وقت جب غزہ کا رابطہ ساری دنیا سے کٹ چکا ہے البتہ مصر کی سرحد سے غزہ تک زیر زمین گیارہ کلومیٹر طویل سرنگ کے ذریعے مصر سے ضروریات زندگی کے علاوہ اسلحہ اور جدید میزائل بھی غزہ پہنچائے جارہے ہیں۔ اسرائیل کو فلسطین پر ظلم کرتے ہوئے ساٹھ برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصے میں اسرائیل نے فلسطین کو معاشی اعتبار سے اتنا کمزور کردیا ہے کہ غزہ میں نہ صرف اشیاء ضرورت کی شدید قلت ہے بلکہ بیروزگاری بھی عروج پر پہنچ چکی ہے۔ غزہ کے مکمل محاصرے سے اس کا رابطہ پوری دنیا سے کٹ چکا ہے۔ غزہ کے باشندے نہ تو کوئی کاروبار کرسکتے ہیں اور نہ ہی غزہ سے باہر کہیں جاسکتے ہیں۔ بھوک، روزگار اور ضروریات زندگی سے محروم فلسطینیوں نے اسرائیلی جارحیت کا حل تلاش کرلیا ہے۔ اسرائیل نے غزہ جانے والے دونوں راستے بند کرکے وہاں اپنی چیک پوسٹیں قائم کردی ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں ادویہ اور غذا کی ترسیل پر بھی پابندی عائد کردی ہے۔ غزہ کے محاصرے کا مقصد صرف اور صرف فلسطین میں معاشی بحران پیدا کرکے غزہ کے عوام کو یہ پیغام دینا ہے کہ انہوں نے حماس کا ساتھ دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مغربی ذرائع کے مطابق اس وقت مصر سے غزہ تک سازوسامان کی منتقلی کے لئے درجنوں غیر قانونی سرنگیں کام کررہی ہیں جس سے غزہ اور مصر کے سرحدی علاقے میں زیر زمین جدید بازار معرض وجود میں آچکے ہیں۔ اس وقت غزہ میں اسمگلروں کے متعدد گروہ سرگرم ہیں۔ جو سوئی سے لے کر کلاشنکوف تک ضروریات زندگی کی تمام اشیاء بھاری معاوضے کے عوض غزہ منتقل کررہے ہیں۔ اشیائے ضرورت میں سب سے زیادہ پٹرول اسمگل کیا جارہا ہے۔

ایک طویل سرنگ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سرنگ کی کھدائی کے لئے ترجیحاً اس گھر کا انتخاب کیا جاتا ہے جو مصر کی سرحد سے زیادہ سے زیادہ نو کلومیٹر کے فاصلے پر ہو۔ مصر کی سرحد اور غزہ کے درمیان بنائی جانے والی ان سرنگوں کی گہرائی 115 فٹ ہے۔ ان سرنگوں کے راستے مصر سے غیر قانونی طور پر اسلحے، دوائیاں، طبی آلات، گاڑیوں کے پرزے، الیکٹرانکس اشیاء، سیمنٹ، سگریٹ، جوتے، کپڑے، فلسطین پہنچائے جاتے ہیں۔ سرنگ تیار کرتے وقت کھدائی کے دوران سمت کے تعین کے لئے قطب نما سے مدد لی جاتی ہے۔ سرنگ کی دیواروں کو گرنے سے بچانے کے لئے ان کے ساتھ لکڑی کے تختے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ ان سرنگوں میں باقاعدہ لائٹ، انٹرکام، اسٹوریج اور خودکار پمپ سسٹم لگا ہوتا ہے۔ غیر ضروری ریت کو صاف کرنے کے لئے ویکیوم کلینرز سے مدد لی جاتی ہے۔ سرنگ کے دونوں کناروں میں رابطوں کے لئے وائرلیس سیٹ استعمال ہوتا ہے۔ سرنگ بنانے والے مزدور ایک دن میں صرف پندرہ میٹر سرنگ بنا پاتے ہیں۔ بغیر کسی وقفے کے چوبیس گھنٹے تعمیر جاری رکھی جائے تو ایک سرنگ تقریباً تین مہینے میں تیار ہوتی ہے جبکہ ایک سرنگ کی تعمیر میں تقریباً ۷۵ ہزار ڈالر خرچہ آتا ہے۔

۱۹۷۹ء میں جب کیمپ ڈیوڈ معاہدے میں بین الاقوامی سرحدوں کا تعین کیا گیا تو فلسطینی علاقہ ''رفاہ'' مصر اور فلسطین میں تقسیم ہوگیا۔ اس دوران غزہ میں ضروریات زندگی پہنچانے کے لئے اسمگلروں نے رفاہ کے راستے غزہ تک سرنگیں بنانا شروع کردیں۔ سرنگوں کی کھدائی کا آغاز ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ مصر سے غزہ تک اسمگلروں کا سارا کاروبار انہی سرنگوں کے راستے ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے غزہ کے رہائشیوں کا سرحد پار کرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے پر مکمل پابندی عائد ہے۔ غزہ کے محاصرے اور جنگ کی وجہ سے فلسطینی ایک جیل میں قید ہیں۔ جسے دنیا کی سب سے بڑی جیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسمگلر ایک ٹرپ کا بارہ ہزار ڈالر بطور معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ سرنگ کے کاروبار سے رابطہ اسمگلروں کے سربراہ کو مقامی افراد سانپوں کا سردار بھی کہتے ہیں۔

مصر سے غزہ جانے والی سرنگ کی کل لمبائی گیارہ کلومیٹر ہے۔ اس سرنگ کی چوڑائی تقریباً سو میٹر ہے۔ ستمبر ۲۰۰۰ء میں اسرائیل نے مصر پر الزام عائد کیا کہ زیر زمین اسلحہ اور میزائل غزہ پہنچانے میں مصر غزہ کا ساتھ دے رہا ہے تاہم اسرائیل کی وزارت دفاع کے ترجمان ''سالوموورڈ'' کا کہنا ہے کہ ایک چیز جو اسرائیل کے حق میں بہتر ہوگی وہ یہ کہ ان سرنگوں کے ذریعے اسلحہ اسمگل بند کیا جائے۔ لیکن حماس کا کہنا ہے کہ اس نے کبھی اسمگلنگ نہیں کی۔ جہاں ضروریات زندگی کی قلت ہو تو وہاں بلیک مارکیٹ خودبخود معرض وجود میں آجاتی ہے۔

گزشتہ ماہ مصر میں جاری مذاکرات کے دوران حماس نے ۳۵ سرنگیں بند کروا دی تھیں مگر یہ پابندی زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی تاہم حماس نے بھی اسرائیل کی جارحیت کا جواب دینے کے لئے فلسطین سے اسرائیل تک سرنگیں بنانا شروع کردی ہیں۔ غزہ کا مکمل محاصرہ کرنے کے بعد اسرائیل نے یہاں تقریباً تین ہزار فیکٹریاں ،سیکڑوں دکانیں اور بازار زبردستی بند کردی تھیں۔ غزہ کے لوگوں کی زندگی کا دارومدار ان سرنگوں پر ہی منحصر ہے۔ جہاں سے انہیں زندہ رہنے کے لئے کھانے پینے کی اشیاء مل جاتی ہیں۔ اگر یہ سرنگیں بھی نہ ہوں تو غزہ کے لوگ زندہ نہ رہیں۔ ۲۰۰۱ء کے بعد سے ہی ان سرنگوں سے ضروریات زندگی کا سامان غزہ تک پہنچانے کا کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔

سرنگوں پر موسمی حالات بھی بہت حد تک اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ سرنگیں مزدوروں کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ اس دوران مزدور سانپوں اور بچھوؤں کے کاٹنے سے ہلاک بھی ہوجاتے ہیں۔ ایک ہفتہ قبل غزہ کے جنوب میں ایک سرنگ کی دیوار گرنے سے پانچ افراد ریت تلے دب کر ہلاک ہوگئے۔ سرنگ تعمیر کرنا ایک خطرناک ترین کام ہے۔ تعمیر کے دوران سانس گھٹنے اور سردی سے گزشتہ چند مہینوں میں ۸۲ مزدور ہلاک ہوچکے ہیں۔

اسمگلنگ کا شعبہ جہاں منافع بخش کاروبار ہے وہیں اس میں بے تحاشا خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اسمگلروں کا کہنا ہے کہ بلاشبہ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ ہم اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر رزق تلاش کرتے ہیں۔ چند دن قبل مصری حکام نے ایک سرنگ میں پانی چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے سرنگ بیٹھ گئی اور دو اسمگلر منوں ریت تلے دب کر ہلاک ہوگئے۔ پٹرول کے کین کا ڈھکن کھلنے سے اس کی بدبو سے دو افراد ہلاک ہوگئے۔ ●●

امریکہ کو خودسر آمریت کی بھاری قیمت چکانی پڑ رہی ہے

محمد آصف ریاض، نئی دہلی

۲۹ رجنوری ۲۰۰۹ء کے انگریزی اخبار ''دی ٹائمز آف انڈیا'' میں واشنگٹن کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی ہے جس خبر کی سرخی اس طرح لگائی گئی ہے: Bush Legecy: D-Grade Infrastructure in US۔ اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے اپنے پیچھے نہایت گھٹیا وراثت چھوڑی ہے۔ امریکی انفراسٹرکچر کی حالت خراب ہوچکی ہے۔ سڑکیں، ریلوے نظام، پشتے، پل اور اسکول تباہ ہوچکے ہیں۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ تباہ شدہ انفراسٹرکچر کو ٹھیک کرنے کے لئے تقریباً ۲،۲ ٹریلین ڈالر خرچ کرنا پڑے گا۔ انفراسٹرکچر کو بہتر بنانے کے لئے حکومت نے پہلے ہی ۸۲۵ بلین ڈالر کا پیکیج جاری کردیا ہے۔ تاہم انجینئروں کا ماننا ہے کہ یہ پیکیج ضرورت سے بہت کم ہے۔ نیویارک کمپنی Hardesty and Hanover میں کام کرنے والے ایک انجینئر ''ہیرمن'' کہتے ہیں کہ امریکی ایوی ایشن ''ڈی پلس'' سے گر کر ''ڈی'' گریڈ کی حیثیت اختیار کرچکا ہے اور اسی طرح امریکی سڑکوں کا گریڈ بھی ''ڈی پلس'' سے گر کر ''ڈی'' ہوگیا ہے۔ ہیرمن کہتے ہیں: ''اگر امریکی انفراسٹرکچر کو ۲۰۰۵ء میں ٹھیک کرالیا جاتا تو اس پر صرف ۱،۷ ٹریلین ڈالر کا خرچ آتا، لیکن اب اسے ٹھیک کرانے میں ۲،۲ ٹریلین ڈالر خرچ کرنا پڑے گا۔ مزید یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خرچ بڑھتا جائے گا۔

بش ایک جنگجو حکمراں تھے۔ وہ ۲۰۰۱ء میں امریکہ کے صدر منتخب ہوئے اور ۲۰۰۹ء تک امریکہ کے صدر بنے رہے۔ انھوں نے اپنے دور اقتدار میں کئی جنگیں لڑیں۔ انھوں نے ۲۰۰۱ء میں گیارہ ستمبر کے حملے کو بہانہ بنا کر افغانستان پر حملہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نعرہ دیا اور ۲۰ رمارچ ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ آور ہوئے۔ بش کے دور حکومت میں مشرق وسطیٰ میں تین چار جنگیں لڑی گئیں۔ ان تمام جنگوں میں امریکہ بلاواسطہ طور پر شریک تھا۔ لگاتار جنگ لڑنے کی وجہ سے امریکی معیشت ٹوٹ گئی اور امریکہ ''گریٹ ڈپریشن'' کا شکار ہوگیا۔ میری لنچ، سٹی گروپ، بینک آف امریکہ جیسے تمام بڑے مالیاتی ادارے دیکھتے ہی دیکھتے دیوالیہ ہوگئے۔ امریکہ میں بیروزگاری عام ہوگئی۔ ۷ رفروری ۲۰۰۹ء کو دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار ''دی ٹائمز آف انڈیا'' کے مطابق امریکہ میں آنے والی معاشی بدحالی کی وجہ سے اب تک تقریباً چھ لاکھ امریکی اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

امریکہ کے معروف ماہر معاشیات تھامس فریڈمین کہتے ہیں: ''امریکی مالیاتی ادارے اپنا اعتماد کھوچکے ہیں۔ وہ تمام لوگ اور کمپنیاں جن پر ہم اعتماد کرتے تھے اب ناقابل اعتماد ہوچکی ہیں۔ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ اب ہمیں اسی صورتحال کے ساتھ جینا پڑے گا۔ ہمارے پاس کوئی ایسی جادوئی دوا بھی نہیں ہے کہ ہم اپنے مالیاتی اداروں کا اعتماد پھر سے بحال کرسکیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ وہ ملک جو ابھی تک تمام شعبۂ زندگی میں دنیا کی رہنمائی کررہا تھا اور سپر پاور بنا ہوا تھا، اچانک اس کی حالت ایسی کیوں ہوگئی؟ اس کی وجہ بش کی جنگجوانہ اور جارحانہ پالیسی ہے۔ اگر جارج ڈبلیو بش امریکہ پر ہونے والے حملے کے بعد سیاسی بصیرت سے کام لیتے اور جنگ کے بجائے اس مسئلے کا سیاسی حل تلاش کرتے تو وہ امریکہ کو ڈوبائے بغیر مجرموں کو سزا دے سکتے تھے۔ لیکن طاقت کے نشے میں وہ اپنی عقل گنوا بیٹھے۔ انھوں نے ایک بددماغ حکمراں کی طرح یکے بعد دیگرے کئی ملکوں پر حملہ کردیا۔ انھوں نے افغانستان کو تباہ کیا، عراق کو اسٹون ایج میں پہنچایا، فلسطین اور لبنان کو تباہ کیا اور پھر شمالی کوریا، شام اور ایران کو دھمکی دینے لگے۔ یہاں تک کہ انھوں نے چین اور روس کو بھی آنکھیں دکھانا شروع کردیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھوں نے پوری دنیا کو دھمکاتے ہوئے کہا: ''یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے دشمنوں کے ساتھ''۔ بش کی اس جارحانہ پالیسی سے دنیا بھر میں بے چینی پھیل گئی''۔ ایک ایک کرکے دنیا کے زیادہ تر ممالک نے امریکہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ امریکہ کے دوست ممالک سعودی عرب، مصر، اردن، پاکستان اور کئی یورپی ممالک بھی بش کی پالیسی سے ناراض ہوگئے۔ نتیجہ کار امریکہ الگ تھلگ پڑ گیا اور اب اسے اپنے کئے کی بھاری قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ امریکی عوام سے یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے دوسری مدت کے لئے بھی بش کو منتخب کرلیا۔ جب امریکیوں کی آنکھیں کھلیں، تب تک کافی وقت نکل چکا تھا۔ تاہم پھر بھی امریکیوں نے تبدیلی کے نام پر ووٹ دے کر ری پبلکن کے بجائے ڈیموکریٹ کے ایک سیاہ فام امیدوار مسٹر اوباما کو اپنا صدر منتخب کرلیا۔ بش کی پالیسی سے پہلے تو صرف دنیا نفرت کرتی تھی لیکن اب امریکی عوام بھی ان سے نفرت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ جس وقت بش وہائٹ ہاؤس سے رخصت ہورہے تھے، لوگ وہائٹ ہاؤس پر جوتے برسا رہے تھے۔ جب جارج ڈبلیو بش بارک اوباما کی حلف برداری تقریب میں تشریف لائے تو لوگ بول اٹھے: ''کاش یہ شخص یہاں نہیں ہوتا''۔ بش نے سمجھا تھا کہ یکے بعد دیگرے کئی ملکوں سے جنگ لڑ کر وہ تاریخ میں اپنا اور امریکہ کا نام روشن کردیں گے۔ وہ امریکی قوم کے ہیرو بن جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ کسی قوم کا اصل ہیرو، وہ ہوتا ہے جو اپنی قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے، نہ کے بربادی کی راہ پر۔ تعمیری ذہن والا انسان ہی کسی قوم کا ہیرو بن سکتا ہے۔ تخریب پسند لوگ بھلے ہی کچھ وقت کے لئے اقتدار پر قابض ہوجائیں، لیکن وہ ہیرو کی حیثیت اختیار نہیں کرسکتے۔ ●●

نئی امریکی قیادت سے مسلم دُنیا کی توقعات

سید شکیل احمد انور، حیدرآباد

مسلم نام کے سیاہ فام عیسائی امریکی کا صدر منتخب ہونا اور 20 جنوری 2009 کو حلف صدارت لے کر قصر ابیض میں داخل ہونا تاریخی عجوبہ سمجھا جارہا ہے حالانکہ اس ملک کی موجودہ اقتصادی و سیاسی صورتحال کے علاوہ عالمی حالات کا دباؤ بھی تھا کہ وہ کسی تبدیلی (Change) کے متقاضی تھے اور وہ تبدیلی ہوگئی۔ امریکی صدر نے اپنی اس تقریر سے جو انہوں نے حلف لینے کے بعد کی اور تقریب ضیافت میں اپنی بیگم کی کمر میں بانہیں ڈال کر رقص کرتے ہوئے یہ اشارہ دے دیا ہے کہ ملک کی سیاسی و تہذیبی روایات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ سیاسی طور پر امریکہ دنیا پر اپنی بالادستی برقرار رکھے گا اور دہشت گردی کے نام پر جاری جنگ (War on Terror) کو جیتنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ عراق کو وہاں کے عوام کے حوالے کردینا اور افغانستان میں اپنی موجودگی کو مستحکم بنانا دو جڑواں اقدامات ہیں، ان کے تناظر میں مسلم دنیا سے از سر نو مکالمہ کی بات کہی گئی ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ مذکورہ تبدیلی عالم اسلام کے لیے کوئی مثبت پہلو نہیں رکھتی۔ فلسطین بمقابل اسرائیل کے سلسلے میں ثانی الذکر کو سیاسی و حربی امریکی حمایت کا حاصل رہنا مشرق وسطیٰ کے احوال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کا اظہار ہے۔

سیاسی تبصرہ نگار لکھ رہے ہیں کہ اپنی انتخابی مہم کے دوران بارک اوباما نے بار بار جس لفظ ''تبدیلی'' (Chang) کی تکرار کی تھی حلف صدارت کے مابعد تقریر میں صرف دو بار اس لفظ کو دہرایا ہے اور وہ بھی کسی خاص عزم کے ساتھ نہیں۔ یہ کہا جانے لگا ہے کہ وہ اپنی بات کہہ چکے اب عمل کرکے دکھانا ہے۔ "He has talked the talk and now he wants to walk the walk" امریکیوں کی اصل پریشانی ان کی ابتر اقتصادی حالت ہے جس کو کسی جادوئی چھڑی سے راتوں رات نہیں بدلا جاسکتا۔ بارک اوباما کے حلف لینے کے بعد بھی اسٹاک مارکیٹ کا گراف نیچے ہی جارہا ہے او ران کا حالیہ مالیاتی اعلان (Financial package) بھی دور گزشتہ کی رعایتوں کی طرح کچھ سطحی لہروں

باقی صفحہ ۷ پر

قرارداد ۱۸۶۰ سے معرکہ عرب میدانوں میں منتقل ہوگا

تحریر: نبیل شبیب
ترجمہ: مسعود الرحمان خان ندوی

آئندہ ایام میں اس طرح کی باتیں بہت سنیں گے کہ بین الاقوامی سیکورٹی کونسل کی قرارداد نمبر ۱۸۶۰، مورخہ ۹ رجنوری ۲۰۰۹ء سے بہتر قرارداد حاصل کرنا ممکن نہیں تھا اور اس کے منفی پہلوؤں کی توجیہات بہت پڑھیں گے کہ عرب ممالک کو اس قرارداد کے قبول کرنے پر مزاحمت اور متعین طور پر حماس کی عاقبت نااندیشی نے مجبور کیا ہے اور اس سب سے اہم بہت سے دباؤ یا ان سے بھی بڑھ کر اقدامات دیکھیں گے تاکہ مزاحمت اس قرارداد کے اہم ترین جزو کو قبول کرکے اپنا فعلی وجود اپنے آپ ختم کرلے اور اس قرارداد کا اہم جزو ہے نام نہاد مصری پہل یا مصری۔ فرنچ پہل سے اس کا ربط وارتباط!

غزہ حملہ کے خلاف مقابلہ وثابت قدمی داستانی تھی اور قتل وبربادی بھی علانیہ وحشتناکی و درندگی کی تمام حدود کو پار کرگئی تھی، نیز مشکل و پریشانی انسانی برداشت کی حد سے تجاوز کرگئی تھی، سیاسی منظرنامہ پر اگرچہ یہی ''پریشانی کا خاتمہ'' تمام مساعی کا اولین مقصد تھا تاکہ نیویارک میں قراردادوں کی تشکیل وتوقیت میں عرب وزارتی وفد کی کامیاب کارگزاری کو نمایاں کیا جائے، اسی لئے اس کی توصیف میں صرف یہ کہا گیا کہ یہ فوری، لازمی، دائمی فائر بندی کی قرارداد ہے لیکن وہ غزہ میں صہیونی قتل عام اور بربادی کے لئے تھی نہ عرب وزارتی خواہش کے مطابق قرارداد کے بعض الفاظ کو مغرب کی طرف سے قبول کرنا تھا بلکہ یہ سب کام متعین عرب حکومتوں کی ان کے عوام کے سامنے قابل ترس مجبوری سے دھیان ہٹانے کے لئے تھا جن کا استحکام اس مسلسل قتل وغارتگری اور بربادی و پریشانی سے خطرے میں تھا اور ان کے سامنے صرف راستے رہ گئے تھے:

(۱) یا تو عوام کی طرفداری کے لئے حملہ، قبضہ واغتصاب کے خلاف مشروع مزاحمت کے ساتھ عملاً علانیہ کھڑی ہوں، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ حکومتیں عرب فلسطینی زمین کے خلاف سنگین جرائم کرنے والے اسرائیلی وجود کی پشت پناہ مغربی طاقتوں کے آمنے سامنے کھڑی ہوں گی۔

(۲) یا مشکل اقدام کے طور پر عرب چوٹی کانفرنس منعقد کریں جس کا وعدہ بین الاقوامی سیکورٹی کونسل سے کچھ اقدام کرانے سے عاجزی پر کر رکھا تھا، خواہ خود اپنی چوٹی کانفرنس میں مطلوب کارروائیوں سے گریز کرتے رہیں۔

موجودہ قرارداد کا اس کی تمام بارودی سرنگوں کے ساتھ انتظار تھا اور وہ ''اہم'' عرب ممالک کو قبول بھی تھی خواہ مطلوب نہ ہو، یہ وہی اہم ممالک تھے جنھوں نے ہنگامی عرب چوٹی کانفرنس کے انعقاد سے انکار کیا، پھر نیویارک بھیجنے کے لئے عرب وفد کی تشکیل نمایاں میں حصہ لیا، جبکہ وفد کے بعض شرکاء (متعین طور پر عرب لیگ کے سکریٹری جنرل اور قطر کے امور خارجہ کے منسٹر آف اسٹیٹ) ان حکومتوں کی سیاسی لائن سے مکمل طور پر متفق نہیں تھے، اس لئے ان کا ''امریکی شریک'' کے ساتھ بعض ملاقاتوں ومذاکرات سے استثناء علانیہ نمائشی (؟) پھر اس استثناء کو قبول کرلینا سب کے لئے توہین آمیز تھا، سیکورٹی کونسل کی قراردادوں کے طویل سلسلے میں موجودہ قرارداد سے صرف یہی بڑا خطرہ نہیں ہے کہ اس کو مسئلہ فلسطین میں حق و انصاف اور فلسطینی قوم اور تمام عرب مسلم اقوام کے مشروع مفادات کے برخلاف علاقے پر تھوپا جائے گا بلکہ زیادہ بڑا خطرہ اس بات سے پیدا ہوگیا ہے کہ یہ قرارداد نقصان اٹھانے والے فریق (عرب) کی شرکت میں صادر ہوئی اور وہ یہ سمجھ رہا ہے یا اپنے بارے میں کہہ رہا ہے کہ اس نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔

قرارداد میں اہم ترین عبارت: ''گزرگاہوں کے کھولنے'' سے متعلق ہے اور اس کو ۲۰۰۵ء کے معاہدے سے جوڑ دیا گیا ہے جس میں غزہ وسیناء کے درمیان فلسطینی عوام کی نقل وحرکت متعین طور پر رفاہ گزرگاہ سے اسرائیلی اقتدار کے ماتحت اور یورپی و مصری مشترک تنفیذ کے ذریعے ہوگی۔ باقی گزرگاہیں تو اسرائیل کے زیر اقتدار مقبوضہ علاقے میں ہیں ہی اور اس کو خوفزدہ رکھنے والی کسی طاقت کی غیر موجودگی میں اس کی مجرمانہ زیادتیوں کے ساتھ اسی کے پاس رہیں گے تا آنکہ وہ آزاد ہوں۔ بہرحال ہم یہاں صرف رفاہ گزرگاہ پر اپنی گفتگو مرکوز رکھتے ہیں۔ اس نوٹ کے ساتھ کہ اس کے ''دوامی'' ہونے کی بات کو مذکورہ بالا معاہدے سے جوڑ دیا گیا ہے جو ابتداء سے فاسد تھا اور اب زمانی لحاظ سے اس کا اثر ختم ہوچکا ہے اور زمینی طور پر اس کا وجود زائل ہوچکا ہے۔ اس لئے قرارداد ۱۸۶۰ء کا مقصد مزاحمت کو دیگر میدانوں میں نشانہ بنانا ہے یعنی مقابلہ کی مزید اشکال و اسباب کو فلسطین کے قلب سے متعین عرب ممالک کے قلب میں (خود ان کی قرارداد قبول کرکے) منتقل کرنا ہے۔ اب شاید اس بات میں کوئی شک نہ ہو کہ رفاہ گزرگاہ کھول کر اور اس کے استعمال میں کسی قید کو رد کرنے کا مطلب اسرائیلی جال میں پھنسنا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ غزہ کو مغربی کنارے سے الگ کرکے ننھی منی فلسطینی ریاست کے منصوبے کا خاتمہ اور اجڑے ہوئے فلسطینیوں کا بوجھ غزہ اور مغربی کنارے سے مصر اور اردن کی طرف منتقل کرنا ہے۔ اس میدان میں صہیونی منصوبوں کے مقابلے کی ضرورت میں کوئی شک نہیں ہے مگر یہ کام فلسطینی قوم کی پریشانی کے اسباب کو راسخ کرکے اور اس کے آس پاس کی دنیا سے اس کا رشتہ کاٹ کر غزہ کو یا مغربی کنارے کو عرب اسلامی دنیا سے ملانے والی اسرائیل کے زیر اقتدار صرف ایک تنہا حدودی پٹی کے ذریعے موجودہ قائم وثابت واقعی صورتحال کو الٹ پلٹ کردینا ہے۔ اس سیاسی مسلک ہی نے فلسطینیوں کو دو فریق میں تقسیم کیا ہے اور یہی مسلک کیمپ ڈیوڈ، میڈرڈ اور اناپولس کارواں سے مربوط ''بے نتیجہ تصفیہ'' کی سیاست کا لازمی جزء ہے، بلکہ موجودہ فلسطینی تقسیم کے ظہور سے پہلے بھی یہ مسلک قائم تھا کہ ایک فریق مزاحمت کرتا تھا اور فلسطینی عوام کے ساتھ مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلتا تھا، اور دوسرا فریق مزاحمت نہیں چاہتا تھا اور فلسطینی عوام کی اکثریت پریشانیوں کے باوجود اس کی سیاست اور پالسیوں کو مسترد کرتی تھی۔

عسکری طاقت کے استعمال سے بحران کا مستحکم حل حاصل ہونے والا نہیں ہے، یہ ایسا موضوع ہے جس پر گفتگو جنگ سے قبل، اس کے دوران اور مابعد جنگ ختم ہونے والی نہیں ہے، بات فی نفسہ صحیح ہے مگر مستحکم حل کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب مسئلہ کا تصفیہ نہیں ہے؟ یعنی ۱۹۴۸ء کی غصب شدہ زمین کو جانے دو، ۱۹۶۷ء کی ہتھیائی ہوئی زمین کو واپس لینے کی کوشش کرو اور ان سے متعلق جو باتیں امن وامان تعلقات کو نارمل بنانے اور مشترک منصوبوں کے بارے میں کہی جاتی ہیں سب کو تسلیم کرو۔

حماس اور دیگر تحریکوں کے وجود اور مزاحمت پسندوں کے راکٹ بنانے کی صنعت سیکھنے اور اس کے استعمال سے کئی دہائیوں پہلے کیا ہر عرب پہل کا منتہائے مقصود یہ تصفیہ نہیں تھا؟ قرارداد نمبر ۱۸۶۰ بھی کم از کم ۱۹۶۷ء سے اب تک کی تمام سابق قراردادوں کی طرح تنہا اسی دائرے میں گھوم رہی ہے۔ اگر اس میں یا اس کے علاوہ کسی قرارداد میں حملوں کی موقوفی اور عوام کی مصیبت و پریشانی کے خاتمے کے بارے میں کوئی بات ہوتی ہے تو وہ تصفیہ کو اس کے اندر موجود تمام مشکلات اور مزاحمت کو ختم کرنے میں شرکت کے اسرائیلی جال سمیت قبول کرنے کے لئے راستے ہموار کرنے سے متجاوز نہیں ہوتی، لیکن آزادی کے مقصد سے اٹھنے والی حماس اور اس جیسی جماعتیں زمین پر موجود حقیقت بن چکی ہیں، جن کو تمام جنگوں، مصیبتوں، محاصرہ اور دشمنی کے باوجود عوامی ادارہ گلے لگائے ہوئے ہے، نیز اولین انتقاضہ سے اب تک اسرائیل کی ظالمانہ طاقت اپنی تمام تر مجرمانہ کوششوں کے باوجود اس اسلامی اور وطنی مزاحمت کے کسی گروہ کو وجود سے اکھاڑ سکی ہے نہ اس کو تصفیہ کے لئے مجبور کرسکی ہے جیسا کہ فدائی میدان عمل میں مقابلہ کرنے والے سابق گروہوں کو مجبور

باقی صفحہ ۵ پر

امریکہ میں توسیع پسندی و بالادستی کی پالیسی پرانی ہے

ایم ابراہیم خان

کسی بھی توسیع پسند قوت کے لئے اپنے بیشتر معاملات کو خفیہ رکھنا ناگزیر ہوتا ہے۔ توسیع پسندی کسی کو پسند نہیں آتی۔ ماضی میں جو ریاستیں دوسری ریاستوں کے مختلف علاقوں یا خطوں پر لشکر کشی کرتی تھیں انہیں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے، صرف طریق ہائے کار تبدیل ہوگئے ہیں۔ امریکہ نے افغانستان اور عراق پر لشکر کشی کی تو شاید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سابق امریکی صدر جارج واکر بش کے آٹھ سالہ اقتدار کے دوران امریکی افواج نے دنیا بھر میں تباہی کا بازار گرم کیا۔ دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر صرف مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا ہے اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف کوئی بھی ترقی یافتہ ملک موثر آواز بلند کرنے کے موڈ میں نہیں۔ جارج واکر بش کے دور میں امریکہ نے جو کچھ کیا اس پر دنیا بھر میں شدید احتجاج کیا گیا۔ تو کیا ولیم جیفرسن کلنٹن کے آٹھ سال مثالی تھے؟ کیا بل کلنٹن کے دور میں امریکہ نے اپنے توسیع پسندانہ اور بالادستی برقرار رکھنے سے متعلق عزائم کو لگام دے رکھی تھی؟ کیا بل کلنٹن کو یہ بات پسند نہ تھی کہ امریکی مفادات کو تحفظ ملے؟ جیمز جانسن نے اپنی کتاب ''دی سوروز آف ایمپائر'' میں اس نکتے پر بحث کی ہے کہ سابق امریکی صدور بل کلنٹن اور جارج بش جونیئر کے درمیان فرق صرف طریق کار کا تھا۔ بل کلنٹن نے بھی امریکی توسیع پسندی کو مہمیز دی تاہم یہ کام انہوں نے اس قدر سکون سے اور ڈھکے چھپے انداز سے کیا کہ دنیا کو کچھ پتا ہی نہ چل سکا۔ بل کلنٹن کے دور میں بھی امریکہ نے دوسری اقوام پر اپنی مرضی مسلط کی اور انہیں تابع بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ کوششیں بہت حد تک بار آور بھی ثابت ہوئیں تاہم زیادہ مزاحمت اور احتجاج تک نوبت نہیں پہنچی۔ بل کلنٹن نے شعوری سطح پر کوشش کی کہ امریکی اقدامات سے دیگر اقوام کے اندرونی معاملات نہ بگڑیں، خون خرابہ کم سے کم اور کسی کو امریکہ پر زیادتی کا الزام لگانے کا موقع نہ ملے۔ سوال معاشی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کا تھا۔ اس مقصد کو بل کلنٹن نے خاصی ذہانت اور سکون سے حاصل کیا۔ بل کلنٹن نے قومی مفادات کا تحفظ یقینی بنانے کے لئے خاصا ڈھکا چھپا اور فریبی طریق کار اختیار کیا۔

جیمز جانسن کی تصنیف ''دی سوروز آف ایمپائر'' سے اقتباسات آپ کی خدمت میں پیش کئے جارہے ہیں۔ یہ اقتباسات کتاب کی مجموعی فکر کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جو اقوام توسیع پسند عزائم رکھتی ہیں وہ عزائم اور ان کی کوکھ سے جنم لینے والے عمل کو ہر حال میں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ توسیع پسند عزائم کی کامیابی کو یقینی بنانے میں مرکزی کردار اس حقیقت کا ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں اختیار کیا جانے والا طریقہ کار کس حد تک دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جاسکا ہے۔ توسیع پسند عزائم پر عمل کی صورت میں احتجاج اور مزاحمت کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ اس لئے ان عزائم اور متعلقہ عمل کو پوشیدہ رکھنا ہی سودمند تصور کیا جاتا ہے۔

توسیع پسند قوتیں اس تاثر کو عام کرتی ہیں کہ وہ کمزور اقوام کے ساتھ جو سلوک بھی روا رکھتی ہیں وہ انہی کے مفاد میں ہے! یا پھر انہی کی غلطیوں کا نتیجہ ہے؟ توسیع پسندی کو کبھی کبھی تہذیب ارتقاء کی لازمی کڑی کی حیثیت بھی دی جاتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں طاقتور اقوام نے کمزور اقوام کو زیر کیا ہے اور یہ عمل اس قدر فطری ہے کہ اس پر قابو پانا کسی کے بس کی بات نہیں۔

۵۰۰ قبل مسیح میں چین کے عظیم فلسفی اور دفاعی تجزیہ کار سن زو نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''دی آرٹ آف وار'' میں لکھا تھا کہ بہترین عسکری حکمت عملی وہ ہے جو سراسر فریب پر مشتمل ہو۔ اگر کوئی ملک اپنے دشمنوں پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس صلاحیت کو پوشیدہ رکھے۔ اسی طرح جب عسکری حکمت عملی پر عمل ہو رہا ہو تب یہ ظاہر کیا جائے کہ جیسے کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ سُن زو کے نزدیک عسکری حکمت عملی میں صرف فریب ہی پایا جانا چاہئے۔ جب آپ دشمن کے بہت نزدیک ہوں تو تاثر یہ دیا جائے جیسے آپ کے اور اس کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں، اور یہ آپ اُس تک پہنچنا ہی چاہتے ہیں۔

سُن زو کی تعلیمات پر سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے عمدگی سے اور سنجیدگی کے ساتھ عمل کیا اور جو کچھ بھی کیا، خاموشی سے کیا۔ ان کے دور میں امریکی معیشت نہ صرف یہ کہ مستحکم ہوئی بلکہ اس میں وسعت بھی پیدا ہوئی۔ سن زو کی تعلیمات کے مطابق بل کلنٹن نے امریکی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی پالیسی پر عمل کے لئے عالمگیریت کا سہارا لیا اور اپنی حکمت عملی کو خاصی کامیابی سے خفیہ رکھا۔ کلنٹن انتظامیہ نے ۱۹۹۷ء کے معاشی بحران میں انڈونیشیا اور جنوبی کوریا جیسے سخت جان حریفوں کو عمدگی سے کمزور کیا اور ارجنٹائن جیسے ممالک سے بہتر طور پر مستفید ہونے کی راہ ہموار ہوئی۔ کلنٹن انتظامیہ نے ملکی اقتصادی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ امریکی دواساز اداروں کی مصنوعات کی قیمتیں بلند رکھنے کے لئے ذہنی اثاثوں کو تحفظ فراہم کرنے کے قوانین کا سہارا لیا گیا۔ عالمی معیشت اور سیاست میں امریکی بالادستی برقرار رکھنے کے لئے آزاد تجارت کا سہارا لیا۔ دوسری طرف سرمایہ دارانہ تجارت کے طور طریقوں سے بھی کما حقہ استفادہ کیا گیا۔

امریکی بالادستی کو فطری اور ناگزیر حقیقت کا تاثر دینے میں مرکزی کردار کلنٹن انتظامیہ کے وزیر خزانہ رابرٹ ریوبن (جو بعد میں سٹی گروپ کے سربراہ بنے) اور بل کلنٹن کے نائب لارنس سمرز نے (جو بعد میں ہارورڈ یونیورسٹی کے صدر مقرر ہوئے) نے ادا کیا۔ بل کلنٹن کے دور میں بھی امریکہ ہی عالمی حکمراں رہا تاہم اس پر زیادہ شور اس لئے نہیں مچایا گیا کہ کسی بھی قوم کو ذلت سے دوچار کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی گئی اور دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر کسی بھی ملک کو نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

جارج واکر بش نے امریکہ کی عسکری قوت پر زیادہ انحصار کیا اور افغانستان کے بعد عراق کو بھی تباہی سے دوچار کیا۔ انہوں نے مخالفین کو صرف عسکری قوت سے کچلنے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں دنیا بھر میں امریکہ سے نفرت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہوا۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء سے قبل بھی صدر جارج واکر بش نے عندیہ دے دیا تھا کہ وہ تمام معاملات کو صرف طاقت سے حل کرنا چاہتے ہیں۔ صدر بش جونیئر کے ابتدائی دور میں امریکہ نے بیلسٹک میزائل اور خطرناک ہتھیاروں پر پابندی اور ماحول کو نقصان پہنچانے والی گیسوں کے اخراج پر قابو پانے سے متعلق معاہدوں سے علاحدگی اختیار کی اور ایک ایسی عدالت کے قیام کی راہ میں بھی دیوار کھڑی کی جس کا مقصد سنگین جنگی جرائم میں ملوث افراد پر مقدمہ چلانا تھا۔ دنیا کو اندازہ ہوگیا تھا کہ جارج واکر بش سب کچھ طاقت کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے دنیا پر واضح کیا کہ امریکہ اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے پیشگی حملے بھی کرسکتا ہے۔ امریکہ نے خود کو نئے روم کی حیثیت سے پیش کیا اور بین الاقوامی برادری کے تمام موجود معاہدوں اور اصولوں کے احترام سے صاف انکار کردیا۔

مارچ ۲۰۰۳ء میں عراق پر لشکر کشی نے ثابت کردیا کہ امریکہ اب خود کو کسی کے سامنے جوابدہ محسوس نہیں کرتا۔ اس یکطرفہ جنگ نے یہ بھی ثابت کیا کہ اب امریکی ایوان ہائے اقتدار پر عسکریت پسند قوتیں متصرف ہیں جو تمام مسائل کو صرف عسکری قوت کے ذریعہ حل کرنے پر یقین رکھتی ہیں اور اس یقین کو ایمان کا درجہ بھی دیتی ہیں۔ امریکی خارجہ پالیسی پر neo-cons کا اثر نمایاں ہے جو صرف عسکری قوت کو تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ جارج واکر بش کو پہلی مرتبہ صدر کا منصب سنبھالے ابھی ڈھائی سال ہی گزرے تھے کہ امریکہ دنیا بھر میں الگ تھلگ ہوتا چلا گیا۔ اس کی خارجہ پالیسی پر یقین رکھنے والے ممالک کی تعداد کم ہوتی گئی اور اس کی فوج پر دباؤ میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس وقت بھی امریکی فوج دنیا بھر میں تعینات ہے۔ عسکری مہمات نے ملٹری اسٹیبلشمنٹ پر دباؤ میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے۔

بل کلنٹن کے زمانے میں امریکہ نے عالمگیریت کے اس قدر فوائد بٹورے کہ دنیا بھر میں اس نظام کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا تاہم حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی ملک پر لشکر کشی نہ کرکے بل کلنٹن نے امریکہ کو براہ راست تنقید سے بچالیا۔ جب بل کلنٹن نے وائٹ ہاؤس چھوڑا تب عالمگیریت کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ دنیا کو یقین تھا کہ عالمی تجارتی تنظیم بہتر ڈھنگ سے کام کرے گی، دنیا سے غربت کا خاتمہ ممکن ہوسکے گا۔ یہ امید بھی باقی تھی کہ عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک جیسے ادارے ان مقاصد کے حصول کے لئے کام کرتے رہے ہیں جن کے لئے انہیں قائم کیا گیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب طاقتور ممالک کی جانب سے اپنی اپنی معیشتوں کو بچانے کی پالیسی پر عمل ہو رہا تھا جب کہ پسماندہ ممالک اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش میں بظاہر ناکامی ہی سے دوچار تھے۔ اور پھر گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء آیا اور عالمگیریت کا خاتمہ ہوگیا۔ کل تک جس نظام سے دنیا نے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں اس کے بارے میں منفی انداز سے سوچنے کا رجحان دنیا بھر میں عام ہوگیا۔ امریکہ استعماری قوت رہا ہے اور ہے۔ بل کلنٹن نے اقتصادی میدان میں اپنی قوت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور امریکی معیشت کے لئے مزید گنجائش پیدا کی۔ بل کلنٹن نے اقتصادی استعمار کا راستہ اختیار کیا۔ ان پر تنقید کم کم ہوئی۔ جارج واکر بش نے وارمشین کا سہارا لیا اور سب کچھ طاقت سے حاصل کرنا چاہا۔ ان کی پالیسی نے کئی ممالک کو تباہ کردیا۔ افغانستان اور عراق کو اس سے زیادہ نقصان پہنچا۔ عالمگیریت کو حقیقی نقصان صدر بش کی پالیسیوں نے پہنچایا جو صرف طاقت کی زبان میں بات کرنا چاہتے تھے اور کسی بھی حوالے سے لچک دکھانے کو تیار نہ تھے۔ ان پر شدید تنقید کرنے والوں میں خود امریکی بھی پیش پیش رہے ہیں۔ افغانستان اور عراق پر لشکر کشی کی مخالفت خود امریکیوں نے بھی کی۔ انہیں اندازہ تھا کہ بش انتظامیہ کی ناقص پالیسیوں سے امریکہ دنیا بھر میں تنہا ہوتا جارہا ہے اور اس سے نفرت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ امریکہ کی جانب سے پیشگی

باقی صفحہ ۸ پر

آدیباسی علاقے نکسلیوں کے گڑھ کیوں؟

عارف عزیز (بھوپال)

ماؤزے تنگ کے اس قول پر خواہ سرمایہ دارانہ نظام کے دشمن اور خود ان کے ملک چین کا اب یقین نہ رہا ہو کہ ''اقتدار بندوق کی نالی سے نکلتا ہے''، لیکن جنوبی ایشیا کی بدقسمتی سے آج بھی یہ کئی علاقوں میں ماؤنوازوں کو انقلاب کے خواب دکھا رہا ہے، شدت پسند بائیں بازو عناصر کے ان تیزابی خوابوں کو جب زمین پر حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو تشدد اور بربادی کا وہ منظر سامنے آتا ہے جو آج کل بہار، اڑیسہ، چھتیس گڑھ اور مدھیہ پردیش سے تلنگانہ تک پھیل رہا ہے۔ حالانکہ مغربی بنگال کے نکسل باڑی علاقے میں جہاں بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں نکسلی سرگرمیوں کی بنیاد پڑی تھی یہ تحریک اب وہاں دم توڑ چکی ہے لیکن دوسری ریاستوں میں اس کا زور بڑھتا جارہا ہے۔ خصوصیت سے انتخابی عمل کے دوران دہشت گرد نکسلیوں کے حملے کافی بڑھ جاتے ہیں جو ملک کے پورے جمہوری عمل سے ان کی بیزاری کو واضح کرتے ہیں۔

مرکزی وزارت داخلہ کے ہمراہ اب تک نکسلی تشدد سے متاثرہ ریاستوں کے وزراء کی کئی کانفرنسیں ہوچکی ہیں۔ ان کانفرنسوں میں مسئلے سے نپٹنے کے لیے پولس فورس اور جدید اسلحہ کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، یقیناً نکسلیوں جیسے منظم گروپوں سے مقابلے کے لیے پولس کو جدید ہتھیار، اچھی گاڑیاں اور اعلیٰ مواصلاتی نظام سے لیس کرنا ضروری ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی غور وخوض ہونا چاہیے کہ آخر ملک کے پس ماندہ آدیباسی علاقوں میں نکسلی تحریک کو استحکام کیوں مل رہا ہے۔ جب مسئلہ کا تجزیہ اس پہلو سے ہوگا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ آزادی کے 61 برس گزر جانے کے باوجود آج بھی ہمارے دیہات خاص طور پر پس ماندہ قبائلی مواضعات سماجی نابرابری اور معاشی استحصال کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ جن میں کمزور لوگوں کو سماجی انصاف یا انتظامیہ کا تعاون نہیں ملتا تو وہ مایوس ہوکر ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرلیتے ہیں۔ جہاں مرتے ہیں وہاں مارتے بھی ہیں۔ حکومت و انتظامیہ چونکہ ان پر ہونے والے ظلم وزیادتی کو ختم کرنے پر توجہ نہیں دیتی بلکہ جہاں کہیں کوئی واردات ہوجاتی ہے تو معمول کے مطابق پولس فورس بھیج دی جاتی ہے جو اپنے مزاج کے مطابق طاقتور کا ساتھ دے کر کمزور کو دبانے کی کارروائی کرتی ہے، اس سے مسئلہ حل ہونے کے بجائے مزید الجھتا جارہا ہے۔

نکسلیوں کے مسئلے کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ناخواندہ نوجوان جانتے بھی نہیں کہ آخر نکسلزم کیا ہے مگر جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا حق مارا جارہا ہے اور قانون و انتظام کی مشنری ان کو انصاف فراہم کرانے سے معذور ہے تو وہ اپنے حق کے حصول کے لیے خود میدان میں نکل آتے ہیں۔ اکثر ذات پات کا تعصب بھی ٹکراؤ کا سبب بنتا ہے کیونکہ پورے ہندوستان کی طرح آدیباسی اکثریت والے علاقوں میں بھی نچلی ذاتوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اس نے اعلیٰ ذات کے لوگوں کے خلاف عام ردعمل پیدا کردیا ہے اور اب تو ہر ظلم وناانصافی کو اسی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔

نکسلی متاثرہ علاقوں میں امن و قانون کو مستحکم بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو پولس فورس کی طاقت سے سلجھانے کا طریقہ اپنانے کے بجائے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مقامی آبادی کو انصاف ملے، ان کی شکایات پر بروقت توجہ دی جائے، خاص طور پر زمینداروں، ساہوکاروں اور دوسرے بااثر لوگوں کے ہاتھوں غریب قبائلیوں کا جو استحصال ہو رہا ہے اس پر قابو پایا جائے، اس سلسلے میں پولس انتظامیہ کی تطہیر بھی ضروری ہے کیونکہ بنیادی طور پر انتظامیہ میں لوگ سماج کے بااثر طبقے سے آتے ہیں اور ان کی ہمدردی اپنے جیسے متمول لوگوں کے ساتھ ہوتی ہیں، اگر وہ مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت کرتے بھی ہیں تو محض دکھاوے کے لیے، اس صورت حال کے برقرار رہنے سے ہی آدیباسی علاقے آج نکسلیوں کے گڑھ بنتے جارہے ہیں۔

اسی طرح مذکورہ علاقوں میں اراضی کی اصلاحات کا کام بھی تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ وہاں کی زمینوں پر بے نامی قبضوں کو ختم کراکر فالتو زمین کو بے زمین غریبوں میں تقسیم کرایا جائے، انتظامیہ کم ازکم مزدوری دلانے میں محنت کشوں سے تعاون کرے، مناسب قیمت پر ضروری اشیاء فراہم کرائی جائیں۔ حکومت نے سماج کے کمزور طبقات کے لیے جو فلاحی اسکیمیں شروع کی ہیں ان کو پوری دیانت داری کے ساتھ نافذ کرایا جائے اور آدیباسی نیز دیہی غریب جوانوں کو پولس، فاریسٹ اور ایگریکلچر محکمات میں زیادہ سے زیادہ نمائندگی دی جائے، پولس و انتظامیہ کا جو عملہ وہاں تعینات ہو وہ خود کو سرکاری ملازم و افسر نہیں عوامی خدمت گار تصور کرے اور دیہی غریبوں نیز قبائلیوں کے ساتھ انسانی سلوک اپنائے اس کی باقاعدہ اسے ٹریننگ دی جائے۔

دراصل نکسلیوں کا مسئلہ قبائلی علاقوں میں ہی نہیں سارے ہندوستان میں سماجی و معاشی استحصال نے پیدا کیا ہے، لہٰذا اس کا علاج زور زبردستی سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے صبر وتحمل اور پختہ عزم کے ساتھ سماجی نابرابری اور معاشی استحصال کو ختم کرنے کی ضرورت ہے تبھی اس میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ ●●

بقیہ: قرارداد ۱۸۶۰ء سے معرکہ......

کرنے، توڑنے اور دھوکہ دینے میں کامیاب ہوئی تھی۔ لیکن اقصیٰ انتفاضہ کے پھوٹ پڑنے اور بڑھتی ہوئی طاقت کے ساتھ ازسرنو مزاحمت کے ظہور کے وقت سے اب تک اسرائیل کو اوسلو سرنگ کے مشابہ کسی وسیلہ سے بھی اس کے ناپاک مقصد کے حصول میں کامیابی نہ ہوئی تو اسنے اس کو غزہ کے خلاف مجرمانہ محاصرہ کے پھر جنگ کے ذریعے حاصل کرنا چاہا۔ یہ سیاق وسباق قرارداد نمبر ۱۸۶۰ کے معنی ومقصود کو متعین کرنے کے لئے پہلا نشان راہ اور اہم عنصر ہے۔ چنانچہ قرارداد لڑائی بند کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ عوامی پریشانی کو ہلکا کرنے کا وعدہ کرتی ہے، پھر ان اقدامات اور کارروائیوں کا مطالبہ کرتی ہے جن میں سے بیشتر عرب ممالک کو نافذ کرنا ہیں۔ یہی بات معرکہ کے دوسرے میدانوں کا دروازہ کھولتی ہے کہ اگر روایتی قتال سے مقصد حاصل نہ ہو تو دیگر شکلوں، محاصرہ، تعاقب، دباؤ، جبر وقہر اور قید و بند سے حاصل کیا جائے۔ مختلف معیاروں سے یہ سرخ نشانات ہیں اور ان میں ٹیپ کا بند ہے: غاصبانہ قبضے کے خلاف مسلم مزاحمت کا مطلب یہ ہے کہ مختلف ممکن وسائل حاصل ہونے والے اسلحے پر اعتماد کیا جائے خواہ ان کو مقامی طور پر بنایا جائے یا باہر سے خریدا جائے یا دشمن سے چھینا جائے، مگر ہر عرب فریق راست یا بالواسطہ طریقے سے اپنے آپ کو اس لئے مسلح کرے کہ اسلحہ فلسطینی قوم اور مشروع مسلح مزاحمت کے گروہوں کے ہاتھوں میں نہ پڑنے پائے تاکہ وہ جدید ترین اسلحے سے لیس غاصب قابض طاقت سے مقابلہ نہ کرسکیں خود اپنے کو قولاً وعملاً غاصب طاقت کے محاذ میں رکھنا ہے (جس کے لئے بظاہر بڑی اہم ترین عرب ملک تیار معلوم ہوتا ہے)

قرارداد نمبر ۱۸۶۰ میں جو عرب شرکت سے صادر ہوئی ہے سب سے خطرناک بات: ''اسلحہ اسمگلنگ'' کے ضمن میں یہ بات ہے کہ کسی بھی عرب فریق کو اپنی وطنی وقومی اور عرب اسلامی نسبتوں نیز انسانیت وانصاف اور بین الاقوامی شرعیت کے معیاروں کی بدولت اپنے کو اپنی برادر فلسطینی قوم کی صف کے بجائے اس کے خلاف دشمن اور مزاحمت کے درمیان ''سیاسی، پولیسی اور جبر وقہر کی ظالمانہ دیوار'' بنتا ہے، یہ قرارداد تمام سابق قراردادوں کے مقابلے میں اسی لئے زیادہ خطرناک ہے کہ اب معرکہ کو قلب فلسطین سے تمام عرب، اسلامی، فلسطینی میدانوں میں پھیلانا ہے (اور جو کام خود ظالم قابض سامراج نہ کرسکے وہ بھائیوں کے خلاف بھائیوں کو کرنا ہے)، اب جو عرب ملک اپنے لئے یہ موقف اختیار کرے گا، ظاہر ہے کہ اس کو اس کی خود دار ناراض اقوام سے تائید ملے گی نہ صفحات تاریخ میں صاف ستھرا صفحہ ملے گا نہ زندگی و موت کے مشترک مسئلہ فلسطین میں عزت و احترام کی جگہ حاصل ہوگی۔

(ہفتہ وار الامان، بیروت)

آخرت پر ایمان

چودھری رحمت اللہ بٹر

یہ وہ ایمان ہے جو انسان کے عمل پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ آخرت کا ماننا وہی قابل قبول ہے جو ان تفصیلات کے ساتھ مان جائے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔ یہی وہ ایمان ہے جو انسان کی مدہوشی دور کرتا ہے اور اسے اپنے کردار و اعمال کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء ورسل کی دعوت کا آغاز اسی ایمان سے ہوا ہے۔ قرآن حکیم میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا: ''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور (لوگوں کو آخرت کی پکڑ سے) خبردار کرو۔'' اگر یہ ایمان کمزور ہو تو پھر اللہ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان صرف علم الکلام اور نعت خوانی تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے اور بات ٹیبل ٹاک سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہی حقیقت ہے کہ جس کو قرآن مجید نے صرف تین آیات میں بیان کردیا ہے۔ سورہ علق میں فرمایا: ''ہرگز نہیں، انسان سرکشی پر آہی جاتا ہے جب خود کو بے نیاز پاتا ہے۔ (یعنی کوئی پکڑ نہیں ہورہی۔ اس کو سیدھا رکھنے والا یہ یقین ہے کہ) اس کو اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔''

انسان جب دیکھتا ہے کہ اس کے اخلاق اعمال کا کوئی نتیجہ دنیا میں نہیں نکل رہا اور اس پر کوئی پکڑ نہیں ہورہی تو وہ اپنی حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔ چنانچہ ظلم کرتا ہے، دوسروں کا مال ہڑپ کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے۔ اسے اپنی حدود میں پابند کرنے والی ایک ہی بات ہے کہ اسے یقین دلایا جائے کہ اس کی پیشی اس کے مالک کے سامنے ہونے والی ہے، جہاں اسے اپنا حساب خود پیش کرنا ہوگا اور اسے اپنے کئے کی جزا وسزا مل کر رہے گی۔ جب اللہ کے سامنے پیش ہونے کے تصور میں کجی آتی ہے۔ یا یہ گمان کرلیا جاتا ہے کہ کوئی پیشی نہیں ہے تو انسان مادر پدر آزاد ہوکر دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے اور اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

قرآن مجید میں ایسے انسانوں کی مختلف اقسام کا ذکر ہوا ہے جو یا تو آخرت کے انکاری ہیں اور اس بنا پر بے خوف ہوکر گناہ وزیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں، یا پھر آخرت کو مانتے تو ہیں لیکن اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے محاسبہ نہیں ہوگا، کیونکہ ان کی خاص حیثیت ہے یا وہ کسی پہلو سے خصوصی سلوک کے مستحق ہیں اور نتیجتاً ان کا آخرت کو ماننا بھی انکار ہی کے مترادف ہوجاتا ہے، اس لیے کہ وہ ماننا ان کی سیرت و کردار پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ سورۃ القیامہ کی پہلی دو آیات میں منکرین آخرت کے نظریات کی تردید فرما کر اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ قیامت واقعی اور شدنی ہے اور وہاں نیکی بدی کا بدلہ بھی لازماً مل کر رہے گا۔ چنانچہ فرمایا'' میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔'' (القیامۃ:1) آیت مبارکہ کے آغاز میں حرف ''لا'' میں تین قسم کے لوگوں کے خیالات کی نفی ہے جو سمجھتے ہیں کہ قیامت نہیں ہوگی اور وہ یہ ہیں:

(۱) قرآن مجید نے بعض لوگوں کا نظریہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے ''یہ لوگ کہتے ہیں، نہیں ہے ہماری زندگی مگر صرف دنیا کی اور ہم (خود ہی) جیتے اور مرتے ہیں اور گردش زمانہ کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو (کوئی اور ہستی زندگی دینے والی اور موت طاری کرنے والی نہیں کہ جس کے سامنے پیش ہونا ہو) درحقیقت ان کو اس کا کچھ علم نہیں بلکہ محض گمان کی بنا پر یہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔'' (الجاثیہ:24)

(۲) دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ دوبارہ اٹھایا جانا اور زندہ کرنا محال ہے، جب کہ ہمارا گوشت گل سڑ جائے اور ہماری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہوکر خاک میں مل جائیں گی۔ ان کا نظریہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے ''کیا یہ (نبیؐ) تمہیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی ہوجاؤ گے اور بس ہڈیاں رہ جائیں گی تو اس وقت تم کو (زمین سے) نکال لیا جائے گا۔ انہونی ہے بالکل انہونی ہے یہ بات جس کا تمہیں وعدہ دیا جارہا ہے۔ زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، اسی میں ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں او رہم ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔'' (المومنون:35 تا37)

یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے: ''بھلا آپ نے دیکھا اس شخص کو جو جزا وسزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا۔'' (الماعون:1تا3)

واقعہ یہ ہے کہ جب اسے جزا وسزا کا یقین ہی نہیں ہے تو کیوں نہ کمزور کے مال سے فائدہ اٹھائے؟ اور وہ کیوں کسی کو کھانا کھلائے یا کھلانے کے لیے کہے؟ اس کی نظر میں تو ایسا شخص بیوقوف کہلائے گا کہ جہاں سے وہ مال لے سکتا ہو نہ لے اور اپنی آسائش کا سامان مہیا نہ کرے۔ وہ بھلا ایثار کیوں کرے جب کہ اسے ستائش کی کوئی امید ہی نہیں ہے۔

3) منکرین آخرت کا تیسرا گروہ مترفین کا ہے یعنی صاحب ثروت، صاحب اقتدار، مال ودولت والے، جاگیردار اور سرمایہ دار وغیرہ۔ ان کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا ''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔'' (سبا:34، 35)

سورہ حم السجدہ (آیت:50) میں اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا'' (انسان کی ناشکری کا یہ عالم ہے کہ) اگر ہم اس کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں اس تکلیف کے بعد جو اسے آئی ہو تو کہہ اٹھتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی اور اگر (بفرض محال) میں واقعی اپنے مالک کی طرف لوٹا دیا گیا تو میرے لیے اس کے پاس بہتری ہے (میں وہاں بھی مزے کروں گا)۔

یہ لوگ دنیا کو اتنا پائیدار مانتے ہیں کہ انہیں اس کے ختم ہونے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ان کے دماغوں میں دوسرا اختاس یہ سماجاتا ہے کہ دنیا میں مجھے جو مال ودولت سے نوازا گیا ہے تو یہ میری قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے ہے اور یہ میرا حق ہے۔ بالفرض اگر آخرت ہوئی بھی تو وہاں اس دنیا سے بڑھ کر بھلائیاں میری منتظر ہوں گی اور وہاں مجھے بہت کچھ ملے گا، اس لیے کہ میں بڑا باصلاحیت اور خوش قسمت شخص ہوں۔ ●●

بقیہ: حماس فلسطینیوں کے احتجاج کا دوسرا نام ہے

جنون تھا کہ توریت کی تاریخ کو دہرایا جائے۔ بارہ لاکھ فلسطینیوں کو دہشت گردی کے ذریعے ان کے گھروں سے دربدر کیا گیا۔ ان کی نسلوں نے بوسیدہ خیموں میں زندگی گزاری۔ اسرائیل اپنی فوجی قوت کے سہارے زندہ ہے۔ فلسطینی اپنی قوت ارادی کے ذریعے زندہ ہیں۔ جب حماس نہیں تھی تب بھی اسرائیلی ظلم وستم کا مقابلہ کرتے رہے۔ یاسر عرفات کی کرپٹ سیاسی پارٹی الفتح نے اس وقت بھی مکھی تک نہیں ماری اور نہ اب مار سکتے ہیں۔ جب اسرائیل نے غزہ سے یہودی آبادیوں کو منہدم کیا تھا اور تمام یہودیوں کو وہاں سے نکالنے کا اعلان کیا تھا اس وقت یہ واضح تھا کہ وہ اندھا دھند فضائی بمباریوں کا راستہ ہموار کر رہے ہیں۔ زمین پر اتر کر دو دو ہاتھ کرنے کی تو ہمت ہے نہیں، صرف فضا سے آگ برسا سکتے ہیں۔ اسرائیل کی یہ جنگ بھی ۲۰۰۶ء کی حزب اللہ کے خلاف جنگ کی طرح ناکام رہی۔ ۳۳ روز کی بمباری کے بعد اسرائیل نے خود ہی جنگ ختم کرنے کا اعلان کیا۔ یہاں اٹھارہ روز کے بعد بھی فلسطینیوں کے عزم میں اضافہ ہوا کمی نہیں۔ اسرائیلی جرنیلوں کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ فلسطینیوں نے خودکش حملے کئے ہیں۔ ان میں عورتیں بھی شامل ہیں، بعض اسرائیلی فوجیوں کے بھیس میں آئے۔ حماس فلسطینیوں کے احتجاج کا نام ہے، کل کوئی اور نام آجائے گا، پرسوں کوئی اور۔ آپ ایک قوم پر بم تو برسا سکتے ہیں لیکن اس پر اپنے پٹھو مسلط نہیں کرسکتے کیونکہ حکومت کرنے کے لئے پٹھو کو بھی گود سے اتار کر زمین پر کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ چلئے غزہ میں حماس کے مبینہ دفاتر کو تباہ کردیا گیا، لیکن وہاں اقوام متحدہ کے دفاتر پر اقوام متحدہ کا جھنڈا نظر نہیں آیا؟ یہ ایجنسی تو ریلیف کا کام کررہی تھی۔ اسرائیل نے روز اول سے ہی براک اوباما کا صبر آزمانے کے بجائے جنگ بندی کردی۔ امید ہے کہ صدر بارک اوباما غزہ کی تعمیر نو پر توجہ دیں گے اور اسرائیل کی سرزنش نہیں ہوگی کیونکہ اس نے یکطرفہ جنگ بندی کردی ہے۔ صدر براک اوباما اور وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے سابق سینٹر George Mitchel کو مشرق وسطیٰ کے لئے خصوصی ایلچی مقرر کیا ہے۔ ایسے بہت سے ایلچی مقرر ہوچکے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ براک اوباما صاحب کی دھاگ کتنی ہے؟ خیر اتنی تو ہے کہ ان کے صدر بننے سے پہلے ہی جنگ بند ہوگئی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں کسی بھی کامیابی کے لئے ایران کا کردار ناگزیر ہے۔ صدر براک اوباما پہلے ہی ایران سے بات چیت کے آغاز کا اشارہ دے چکے ہیں لیکن فلسطینیوں کے حامی مسلمان ممالک یہ دیکھیں گے کہ اس میں فلسطینیوں کا کیا فائدہ ہے۔ علاقے کا کیا فائدہ ہے اور خود انفرادی طور پر ان کا کیا فائدہ ہے؟ اگر فائدہ صرف اسرائیل کا ہے تو پھر یہ تنازع جاری رہے گا۔ ●●

کلیان کے فرزند کو پارٹی ٹکٹ نہیں

ممبئی- سماج وادی پارٹی کے جنرل سکریٹری امر سنگھ نے کہا کہ اترپردیش کے سابق وزیراعلیٰ کلیان سنگھ سے سماج وادی پارٹی کے بڑھتے ہوئے رشتے محض اترپردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی اور زعفرانی طاقتوں کو شکست دینے کے ارادے سے استوار کئے گئے ہیں نیز لوک سبھا انتخابات میں پارٹی انہیں اور ان کے فرزند کو ٹکٹ نہیں دے گی۔ انہوں نے نامہ نگاروں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ بابری مسجد تو شہید ہوگئی لیکن اس کے ذمہ داروں کو شکست دینا ضروری تھا۔ اس کے لئے کلیان سنگھ سے مدد لی جارہی ہے۔

اہم خبروں کا اختصار

ملکی

● نئی دہلی سپریم کورٹ نے ریگنگ کے واقعات کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے ریاستی اور مرکز کے زیرانتظام حکومتوں کو ہدایت دی ہے کہ ریگنگ روکنے میں ناکام تعلیمی اداروں کی منظوری ختم کردی جائے اور ریگنگ کرنے والے طلباء کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ عدالت نے یوجی سی کو ایسے اداروں کو مالی مدد نہ دینے کے لئے کہا ہے۔

● پوربندر- انڈین کوسٹ گارڈ نے ۱۸ پاکستانی ماہی گیروں کو ان کی دوکشتیوں کے ساتھ پوربندر ساحل سے گرفتار کیا ہے۔

● گورکھپور- گورکھپور پولیس کا کہنا ہے کہ اس نے قتل کے ایک معاملے میں مرکزی وزیر مہابیر پرساد کے خلاف جانچ شروع کی ہے اگر ان کے خلاف مناسب ثبوت مل گئے تو ان کی گرفتاری ممکن ہے۔

● ممبئی- سماج وادی پارٹی کے لیڈر امر سنگھ نے کہا کہ کانگریس سی بی آئی کا استعمال ان کی پارٹی کے سربراہ ملائم سنگھ یادو کے خلاف کررہی ہے جس نے تفتیش کے بغیر ہی عوامی مفاد کی عرضی میں لگائے گئے الزامات کی بنیاد پر ملائم سنگھ کے خلاف آمدنی سے زائد املاک کا معاملہ درج کرلیا ہے۔ سی بی آئی کا مطلب کانگریس بیورو آف انویسٹی گیشن ہوگیا ہے۔

● نئی دہلی- مرکزی وزیر داخلہ پی چدمبرم نے یہاں کہا کہ پاکستان کی طرح گجرات کے وزیراعلیٰ بھی یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ ممبئی حملے کے تار ہندوستان کی سرزمین سے جڑے ہوئے ہیں تو کیا نریندر مودی کے تار پڑوسی ملک سے جڑے ہوئے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے رابطے میں ہیں۔

● کلکتہ- رضوان الرحمٰن کے قتل معاملے کی جانچ کرنے والے پولیس افسر ایڈم منا کی پر اسرار حالت میں موت ہوجانے سے اس معاملے میں نیا موڑ آگیا ہے۔ رضوان کی لاش سب سے پہلے اسی افسر نے دیکھی تھی۔

● بنگلور- مرکزی وزیر دفاع اے کے انٹونی نے کہا ہے کہ ہندوستان عالمی کساد بازاری کے باوجود دفاعی تیاریوں اور اسلحہ کی خریداری میں کسی قسم کی تخفیف کا ارادہ نہیں رکھتا۔

● بنگلور- ایئر فورس کے سربراہ ایف ایچ میجر نے کہا ہے کہ ممبئی میں ۹رفروری کو ایئر انڈیا کے طیارے سے ٹکرانے سے بال بال بچے صدر جمہوریہ کے دستے میں شامل تین ہیلی کاپٹروں کے پائلٹوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ساری غلطی اے ٹی سی کی تھی۔

● نئی دہلی- سپریم کورٹ نے پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ کیپٹن امریندر سنگھ کی ایک عرضی کو پانچ ججوں پر مشتمل ایک آئینی بنچ کے حوالہ کردیا ہے جس میں انہوں نے پنجاب ریاستی اسمبلی سے اپنی برطرفی کو چیلنج کیا ہے۔

● لکھنؤ- اترپردیش اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے پہلے دن اپوزیشن نے جم کر ہنگامہ کیا، گورنر ٹی وی راجیشور کو سماجوادی پارٹی نے کالے جھنڈے دکھائے اور ان پر کاغذ کے گولے پھینکے، بی جے پی نے گورنر کے خطبہ کا بائیکاٹ کیا۔

● نئی دہلی- سپریم کورٹ نے اترپردیش کے سابق وزیراعلیٰ ملائم سنگھ یادو اور ان کے خاندان کے دیگر ممبران کے خلاف آمدنی کے معلوم ذرائع سے زائد جائداد رکھنے کے معاملہ میں مرکز کے اشارے پر قدم اٹھانے کے لئے سی بی آئی کی سرزنش کی اور اپنا فیصلہ محفوظ رکھا۔

● نئی دہلی- سی پی آئی (ایم) کے جنرل سکریٹری پرکاش کرات اور سی پی آئی کے جنرل سکریٹری اے بی بردھن نے دفاعی سودوں میں دلالی اور بدعنوانی کے معاملے میں سی بی آئی جانچ کا سامنا کرنے والی اسرائیلی ایئرکرافٹ انسٹی ٹیوٹ کو فضائی دفاعی میزائل سسٹم کی سپلائی کا دس ہزار کروڑ روپے کا ٹھیکہ دیئے جانے پر سخت اعتراض کیا ہے اور اسے رد کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

● نئی دہلی- مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل نے کہا ہے کہ تمام ریاستوں کو اپنے بجٹ میں تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل مخصوص کرنے ہوں گے۔

● ممبئی- مرکزی وزیر داخلہ پی چدمبرم نے ملک کی اقتصادی شرح ترقی سات فیصد بنے رہنے کا امکان ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ معیشت کساد بازاری میں نہیں سست رفتاری میں ہے۔ ملک میں اقتصادی کساد بازاری نہیں ہے لیکن معیشت کی شرح ترقی سست ہے۔

بین الاقوامی

● اسلام آباد- جیو نیوز چینل کی رپورٹ کے مطابق ممبئی حملوں کے معاملے میں دفاعی کمیٹی کی ہدایات اور ایف آئی اے کی تحقیقات کی روشنی میں اجمل قصاب سمیت ۱۳ر افراد کے خلاف انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت پاکستان میں مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ جب کہ نیوز چینل ڈان نے وفاقی وزیر داخلہ رحمٰن ملک کے حوالے سے خبر کی تردید کی ہے۔

● ماسکو- ہندوستان نے روس کے ساتھ ۷۰ کروڑ ڈالر کے جوہری ایندھن کے معاہدے پر دستخط کئے ہیں۔ روس کی سرکاری جوہری کمپنی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ روس ہندوستان کو جوہری ری ایکٹر اور ایندھن سپلائی کرے گا۔

● کابل- طالبان نے یہاں تین سرکاری عمارتوں پر خودکش حملے کئے اور فائرنگ کی جن میں ۱۹ر افراد ہلاک اور ۵۰ سے زائد زخمی ہوگئے۔ سرکاری اہلکار یرغمال بھی بنائے گئے۔

● دوبئی- تقریباً ۵۵ ہزار رہائشی ویزے جنوری میں منسوخ کئے جانے سے غیرملکی اپنے وطن واپس لوٹ رہے ہیں۔ ہندوستانی قونصل جنرل وینوراجہ منی کے مطابق ان میں ۲۰ ہزار ہندوستانی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی مہینے میں نئے رہائشی ویزے کے اجراء کی تعداد ۸۸۴۲۳ تھی۔

● پیرس- انٹرپول نے عسکریت پسندوں کے خلاف الرٹ کے تحت مبینہ القاعدہ اور دیگر تنظیموں کے ۸۵ مشتبہ عسکریت پسندوں کے خلاف آرینج نوٹس جاری کیا جو دہشت گردانہ حملوں کی منصوبہ بندی کے الزام میں سعودی عرب کو مطلوب ہیں۔

● ڈھاکہ- وزیراعظم شیخ حسینہ واجد کی عوامی لیگ پارٹی کے رہنما ظل الرحمٰن بنگلہ دیش کے نئے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ وہ اس عہدے کی دوڑ میں واحد امیدوار تھے۔

● واشنگٹن- امریکی محکمہ خارجہ کے کارگزار ترجمان رابرٹ ووڈ نے کہا ہے کہ پاکستان نے امریکہ سے یہ یقینی بنانے کے لئے قدم اٹھانے کا وعدہ کیا ہے کہ جوہری سائنسداں عبدالقدیر خاں آئندہ کبھی جوہری معلومات کی اسمگلنگ اور توسیع میں شامل نہیں ہوں گے۔

● کھٹمنڈو- نیپال کے صدر رام برن یادو کے ذریعہ برسراقتدار ماؤنوازوں کی ''پیپلس وار'' کی ۱۴ویں سالگرہ پر منعقد ہونے والے پروگرام میں شرکت سے انکار کے باوجود سابق ماؤنوازوں نے جو دعوت نامے تقسیم کئے ہیں اس میں مہمان خصوصی کے طور پر قومی صدر کا نام درج ہے۔

● اقوام متحدہ- اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون نے اسرائیل کی جانب سے غزہ میں اقوام متحدہ کے اسکول پر حملے کی انکوائری کا حکم دیا ہے۔ اس کی رپورٹ ایک ماہ کے اندر پیش کرنے کو کہا گیا ہے۔

● بغداد- عراق کے وزیراعظم نوری المالکی نے امریکہ کے نائب صدر جوزف بائیڈن کے اس بیان پر سخت تنقید کی ہے کہ عراق میں اصلاحات کی رفتار سست ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ پرانی تنقید ہے اور عراقی حکومت کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔

● واشنگٹن- امریکی صدر بارک اوبامہ نے افغانستان اور پاکستان کے بارے میں امریکی پالیسی کا ازسرنو جائزہ لینے کے لئے کمیٹی تشکیل دی ہے اور یہ کام اپریل میں ہونے والی ناٹو کانفرنس سے پہلے کرلیا جائے گا۔

● واشنگٹن- امریکی جنرل جیمس کارٹ رائٹ نے کہا ہے کہ ایران کا خلا میں سیارچہ بھیجنا ایک ابتدائی کوشش ہے لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ وہ طویل فاصلہ تک مار کرنے والے بین البراعظمی میزائل تیار کرنے کے قریب ہے۔

● واشنگٹن- امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے کہا ہے کہ وہ صدر بارک اوبامہ سے آئندہ چند دنوں میں افغانستان کے لئے فاضل فورس کی تعیناتی پر فیصلہ کرنے کی امید کرتے ہیں۔

● واشنگٹن- امریکی کانگریس کے رکن پیٹر ہوئیکسٹرا نے کہا ہے کہ عراق میں کیا ہوتا ہے اور افغانستان میں کیا ہوتا ہے۔ پانچ ممالک ایسے ہیں جن کے بڑے مفادات ان سے وابستہ ہیں اور وہ روس، چین، پاکستان، ہندوستان اور ایران ہیں۔

● لندن- چرچ آف انگلینڈ کے ارکان نے دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں بشمول برٹش پارٹی میں پادریوں کی شمولیت پر پابندی لگادی ہے۔

انتخاب کالعدم کرنے کا عوامی اختیار

ممبئی کے حالیہ حملوں کے بعد بھی خوف وغصہ برقرار ہے۔ حکومت کی غیرموثر کارروائیوں اور عدم صلاحیت کے خلاف عوام کا غصہ ہے۔ سیاسی جماعتوں کی بے حسی اور بے عملی کے خلاف غصہ ہے اور انتظامیہ کی سست کارکردگی بھی عوامی غصہ کا شکار ہے۔ اس غصہ کی حمایت اور ہمدردی نہ کرنا بہت ہی مشکل ہے لیکن اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ یہ غصہ صحیح رُخ پر ہو اور حکومت اور برسراقتدار طبقہ پر مطلوبہ اثر ڈالے۔ اس میں تبدیلی لانے کی قوت ہونی چاہئے اور اس طریقہ کار میں تبدیلی جو ہم بحیثیت قوم دہشت گردی کے خلاف اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ پولیس اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کے انتظامی ڈھانچے میں تبدیلی اور اس کو سیاسی طور پر استعمال کرنے پر پابندی ہونی چاہئے۔ تبدیلی یہ بھی کہ مرکزی اور ریاستی انٹلی جنس ایجنسی ایک دوسرے سے کس طرح تال میل رکھتی ہیں۔ اس طریقہ کار میں تبدیلی جو مرکزی ایجنسیاں اپنے طور پر باہم رابطہ رکھتی ہیں۔ اس طریقہ کار میں تبدیلی جس طرح دہشت گرد تلاش کئے جاتے ہیں اور انہیں پکڑا جاتا ہے لیکن سب سے اہم یہ ہے کہ ہم قائدین کی طرف سے تبدیلی چاہتے ہیں۔

آخری تبدیلی اسی وقت ہوسکتی ہے جب دستور میں تبدیلی کی جائے اور منتخب افراد کو واپس بلانے کا اختیار عوام کو دیا جائے۔ یہ ایک طاقتور ذریعہ ہے جو ہندوستانی قائدین کے بے فکر طرز عمل کو ہلا کر رکھ دے گا۔ ایک مرتبہ منتخب ہونے کے بعد ان کی کارکردگی کے محاسبہ کا کوئی طریقہ نہیں ہے الا یہ کہ دوبارہ الیکشن ہو اور وہ اس میں حصہ لیں۔ اس طرح وہ آزاد ہیں۔ اس وقت تک جب تک دوسرا الیکشن نہ ہو۔ ایک مشہور جریدہ کے مطابق ''برسراقتدار طبقہ اب قومی الیکشن میں اپنی نااہلی کی قیمت چکائے گا۔'' اس وقت وہ حکومت کے لئے ریفرنڈم ہے جب کہ الیکشن چند ماہ دور ہیں لیکن عام پانچ سال کی مدت کسی نااہل حکومت کو سزا دینے کے لئے ایک لمبی مدت ہے۔

غلط حکمرانی کے بعض اہم گوشوں کے لئے شہریوں کو اس کی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے منتخب کردہ افراد کو واپس بلاسکیں۔ مقننہ کی کارکردگی کے مسئلہ کا بھی ایک قابل عمل حل ہے۔

منتخب افراد کے الیکشن کو کالعدم کرنے کا اقدام امریکہ میں بیسویں صدی کی ابتداء میں ایک بڑی اصلاح تھی۔ اب بھی فیڈرل نظام میں اس پر پابندی ہے۔ لیکن امریکہ کی کئی ریاستوں میں مقامی سطح پر الیکشن کالعدم کرنے کی اجازت ہے۔ گرے ڈاوگورنر کیلیفورنیا کو ریاستی بجٹ کے غلط استعمال پر واپس بلالیا گیا۔ ڈورس ایل اسٹیکل کیلی فورنیا ریاستی اسمبلی، میئر ڈوروا اسٹیلی کینٹ واشنگٹن میں اور میئر جیمس ویسٹ اسپوکین واشنگٹن کو واپس بلالیا گیا۔

کینیڈا اور وینزویلا کے دستور میں بھی اس کی دفعات ہیں کہ نمائندوں کو متعین شکایتوں پر واپس بلالیا جائے۔ وینزویلا دستور کی دفعہ ۷۲ میں کسی بھی منتخب نمائندہ کو جس میں صدر بھی شامل ہے واپس بلایا جاسکتا ہے۔ یہ دفعہ کہتی ہے کہ جو عہدے عوامی ووٹ کے ذریعہ پُر کئے جائیں وہ عوامی ووٹ کے ذریعہ رد بھی کئے جاسکتے ہیں۔ ایک مرتبہ اس عہدہ کی نصف مدت جس کے لئے منتخب کیا گیا ہے ختم ہو متاثرہ انتخابی حلقوں کے ۲۰ فیصد رجسٹرڈ ووٹر، انتخاب کو کالعدم کرنے اور ریفرنڈم کرانے کی درخواست کرسکتے ہیں۔ اگر منتخبہ فرد کے ووٹرس کی تعداد ۲۵ فیصد یا اس سے زائد ہو اور انتخاب کالعدم کرنے کے لئے ریفرنڈم کی حمایت کریں تو منتخبہ افراد کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا جائے گا۔

انتخاب کالعدم کرنے کی مخالفت میں جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک تکلیف دہ عمل ہے اور مزید الجھنیں پیدا کرے گا۔ ایک ایسی پارلیمانی جمہوریت میں جو شور اور ہنگاموں سے پُر ہے۔ لیکن دستور میں ترمیم کے ذریعہ انتخاب کو کالعدم کرنے کی دفعہ شامل کرنا اور ریاستی اور مرکزی الیکشن ایک ساتھ کرانا اس کی انتخابی اصلاح کے لئے بنیادی حیثیت ہے اس سے جمہوریت میں اعتماد بڑھے گا اور حکمرانی کے ساتھ جوابدہی کا ایک کلچر پروان چڑھے گا۔ یہ وہ چیز ہے جو ہندوستانی عوام چاہتے ہیں۔ غصہ اور موجودہ قانون کی خلاف ورزی کے اس ماحول میں جو مستقل تبدیلی لاسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ حکومت زیادہ جوابدہ ہو اور کسی بھی معاملے سے نمٹنے کے لئے ضروری اقدام کرسکیں۔ انتخاب کو کالعدم کرنے کا اختیار پھر عوام کو یہ حق دیتا ہے جو ہماری حکومت کو منتخب کرتے ہیں۔ (ٹائمز آف انڈیا سے ترجمہ، از: ابوالکرم عرفان)

بقیہ: اقتدار کی تبدیلی کا مطلب پالیسی میں تبدیلی نہیں

تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ دونوں ملک ایک دوسرے سے کافی قریب ہوگئے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دونوں کے درمیان ابھی تک صرف تجارتی نوعیت کے تعلقات ہیں۔ ہندوستان جب بھی دیگر شعبوں خصوصاً پاکستان کے تعلق سے امریکہ سے مدد کی درخواست کرتا ہے تو اسے نفی میں ہی جواب ملتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ امریکہ ہندوستان کے ساتھ تعلقات کو کچھ مخصوص شعبوں خصوصاً تجارت تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے کسی معاملے میں وہ دلچسپی لیتا ہے اور کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کا مقصد ہندوستان کی مدد کرنا نہیں بلکہ مستقبل میں اپنے مقاصد کے لئے اسے استعمال کرنا ہوتا ہے جیسا کہ ممبئی حملے میں سبھی نے دیکھا کہ ایف بی آئی نے معاملے کی تحقیق کی اور آخر تک حکومت ہند یہ سمجھتی رہی کہ اس معاملے میں امریکہ اس کی مدد کرے گا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔

سابق امریکی صدر نے ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلقات کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا لیکن ہندوستان کے تعلق سے خارجہ پالیسی وہی رہی جو سابق سوویت یونین کی طرف سے ہندوستان کے جھکاؤ کے وقت تھی۔ جس جوہری معاہدہ کو ہند۔ امریکہ تعلقات میں ایک نیا باب کہا جارہا ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ اس سے ہندوستان کو کافی فائدہ پہنچے گا لیکن دوسری طرف یہ بھی کہا جارہا ہے کہ نقصانات کے اندیشے بھی کم نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالیہ عرصے میں پاکستان۔ امریکہ کے تعلقات کچھ کشیدہ ہوئے ہیں خصوصاً پاکستان میں حکومت کی تبدیلی اور صدر پرویز مشرف کے ہٹنے کے بعد، اور دوسری طرف ہندوستان سے تعلقات مضبوط ہوئے ہیں، لیکن ہندوستان کو اب بھی امریکہ کے اتحادی ملک کا درجہ حاصل نہیں ہوا ہے۔ تعلقات میں اچانک پیش رفت کی وجہ یہ بتائی جارہی ہے کہ امریکہ ہندوستان کے ساتھ تعلقات بہتر کرکے ایسا ماحول بنانا چاہتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے چین کے خلاف استعمال کرسکے جو سابق سوویت یونین کے زوال کے بعد خطے میں امریکہ کے لئے زبردست چیلنج بنا ہوا ہے۔ فوجی اور معاشی دونوں لحاظ سے مضبوط ہونے کی وجہ سے حالیہ عرصے میں ہر بین الاقوامی معاملے میں امریکہ کی مخالفت کررہا ہے خصوصاً شمالی کوریا اور ایران کے معاملے میں امریکہ کو اس کا کافی تلخ تجربہ رہا ہے۔

اب تک کا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ امریکہ کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنے سے ہندوستان کو وہ فائدہ حاصل نہیں ہورہا ہے۔ جس کی وہ توقع کرتا رہا ہے۔ نئے امریکی صدر نے ابھی تک کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا ہے کہ وہ اپنی حکومت کی پالیسی میں ہندوستان کو وہ اہمیت اور مقام دیں گے جس کی توقع یہاں کی حکومت کررہی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اپنی ٹیم میں بعض ہندنژاد لوگوں کو شامل کیا ہے جس پر ہندوستان خوش بھی ہے لیکن وہ لوگ پالیسی ساز محکموں میں نہیں ہیں۔ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اوبامہ حکومت نے ابھی تک ہندوستان سے متعلق اپنی کوئی خاص پالیسی بنائی ہی نہیں ہے۔ ابھی تک دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی جو نوعیت ہے وہ سابقہ حکومت کی پالیسیوں کے مطابق ہے۔ جس جوہری معاہدے کو ہندوستان بڑھا چڑھا کر پیش کررہا ہے اس پر مسٹر اوبامہ ابھی تک معنی خیز خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا جلدبازی ہوگی کہ جوہری معاہدے سے ہند۔ امریکہ جتنے قریب ہوتے ہیں اوبامہ حکومت میں وہ قربت اور بڑھے گی کیونکہ ابھی تک ہندوستان اوبامہ کی ترجیحات میں جگہ نہیں پاسکا ہے۔ وہ اقتصادی بحران، معاشی کساد بازاری اور بڑھتی ہوئی بیروزگاری جیسے ملک کے سنگین مسائل کے علاوہ خارجی سطح پر جس بات پر سب سے زیادہ توجہ دے رہے ہیں وہ عالم اسلام ہے۔ جہاں امریکہ کی بگڑی ہوئی شبیہ اور درپیش چیلنجز سنگینی میں امریکہ کے اقتصادی بحران سے کم نہیں ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ ہندوستان کا جو ماضی رہا ہے اور اس کی جو پالیسیاں ہیں۔ امریکہ شاید ہی ہندوستان کو اتحادی ملک کا درجہ دے سکے۔ پاکستان کی طرح اسے بھی اپنے ناجائز مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے تعلقات کو کچھ اور مضبوطی فراہم کرے۔ اس سے زیادہ ہندوستان کو امریکہ کی نئی حکومت سے توقع نہیں کرنی چاہئے۔ ●●

یونانی طبی کانفرنس

بھیونڈی- آل انڈیا یونانی طبی کانگریس بھیونڈی کی طرف سے ۱۰رفروری کو یونانی طبی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ کانفرنس کی صدارت حکیم تسخیر فہمی نے کی۔ کانفرنس میں ۸۵۰ مندوبین نے شرکت کی۔ طبی کانگریس کے اعزازی جنرل سکریٹری حکیم سید احمد خاں نے تجاویز پیش کیں۔ کانفرنس میں طبی امور پر تبادلہ خیال، تصانیف کے اجراء کے علاوہ ملک کے معروف حکماء کو ایوارڈ بھی دیا گیا۔

گرلز اسکول کا سالانہ اجلاس

نئی دہلی- گرلز سکینڈری اسکول حویلی اعظم خاں آصف علی روڈ کے منعقدہ سالانہ جلسہ میں بچیوں نے مختلف پروگرام پیش کئے اور بہتر کارکردگی پر بچیوں کو انعامات دیئے گئے۔ اس موقع پر اسکول کے میگزین پر یورتن کا اجراء بھی عمل میں آیا۔

ڈیڑھ سالہ جنگ بندی پر اتفاق

لندن- بی بی سی اُردو کے مطابق حماس کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ اسرائیل کے ساتھ طویل المدتی جنگ بندی کے منصوبے پر اتفاق رائے ہوگیا ہے اور منصوبے کا اعلان آئندہ اڑتالیس گھنٹوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اس بات کا اعلان حماس کے نائب لیڈر موسیٰ ابومرزوق نے مصر میں کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جنگ بندی کے اعلان سے قبل حماس دیگر فلسطینی گروپوں سے بھی بات کرے گی۔

اسرائیلی حکام کی جانب سے اس بیان پر فوری ردعمل سامنے نہیں آیا ہے۔ مصر کے سرکاری خبررساں ادارے مینا کے مطابق موسیٰ ابومرزوق نے کہا ''ہم نے غزہ کی پٹی اور اسرائیل کے درمیان رابطے کے چھ راستے کھولنے اور ہرقسم کی فوجی نقل وحرکت اور جارحیت روکنے کے لئے بدلے میں اسرائیل کے ساتھ ڈیڑھ برس کی جنگ بندی پر اتفاق کرلیا ہے۔'' اس سے قبل قاہرہ میں حماس کی مذاکراتی ٹیم کے رکن طاہر النانو نے خبررساں ادارے رائٹرز کو بتایا تھا کہ (جنگ بندی) معاہدے کی راہ میں حائل زیادہ تر رکاوٹیں دور ہوچکی ہیں۔

دعائے مغفرت

● نئی دہلی- میرے ماموں جناب شمیم اختر خاں کارکن ساپتا ہک شودھن ممبئی کی بڑی صاحبزادی کا طویل علالت کے بعد ۲۸ سال کی عمر میں ۱۲رفروری کو انتقال ہوگیا۔ اس سے قبل بھی ڈیڑھ سال کے اندران کی دو صاحبزادیوں کا انتقال ہوگیا۔

محمد اعظم خاں، کارکن سہ روزہ دعوت، نئی دہلی

● نئی دہلی- میرے ایک عزیز محمد تصدق خاں کا ۱۱رفروری کو انتقال ہوگیا۔ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔

محمد مصطفیٰ خاں سابق کارکن سہ روزہ دعوت، نئی دہلی

● بریلی- محمد ارشد خاں ولد جناب ظہیر الحسن خاں صاحب رکن جماعت گکرالہ ضلع بدایوں کا بس کے حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر ۴۲ سال تھی اور سرکاری اسکول میں مدرس تھے۔

انعام اللہ اصلاحی، ناظم علاقہ، بریلی

● بجنور- مولانا اشرف علی قاسمی (عمر ۹۵ سال) رکن جماعت سیوہارہ ضلع بجنور کا ۷رفروری کی شب میں انتقال ہوگیا۔

عبدالغفار صدیقی ناظم علاقہ بجنور

مرحومین کیلئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے

جماعت کے مرکزی ذمہ داران کی ماہانہ نشست

نئی دہلی- جماعت اسلامی ہند کے مرکزی ذمہ داران کی ماہانہ نشست ۳رفروری کو امیر جماعت مولانا سید جلال الدین عمری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ نشست میں مختلف شعبوں کی رپورٹیں پیش ہوئیں۔ شعبۂ اسلامی معاشرہ کے سکریٹری مولانا محمد رفیق قاسمی نے جنوری میں اسلامک سرکل آف جاپان کی دعوت پر جاپان کا دورہ کیا۔ ٹوکیو کی پانچ مساجد اور پانچ دیگر مقامات پر درس قرآن اور خطاب عام کے پروگرام ہوئے۔ اسلامی معاشرہ کے قیام کی اہمیت وضرورت اور طریقہ کار کو موضوع گفتگو بنایا گیا۔ کم وبیش ایک ہزار افراد سے گفتگو اور خطاب کا موقع ملا۔ مولانا محمد رفیق قاسمی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کے موضوع پر جامعہ میں منعقدہ سمینار میں بھی شرکت کی۔ دہشت گردی کے موضوع پر ایک ٹی وی ڈیبٹ میں شرکت کی گئی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدہ صورت حال پر غور کرنے کے لئے سوامی اگنی ویش کے ذریعہ منعقدہ ایک میٹنگ میں بھی شرکت ہوئی۔

سکریٹری شعبہ تربیت جناب عبدالباسط انور نے اپنے دورۂ آسام کی روداد پیش کی۔ موصوف نے وہاں آسام شمال کا تربیتی دورہ کیا اور رفقاء کے جائزہ اور تنظیمی وتربیتی اجتماعات میں شرکت کی۔ حلقے کی مجلس شوریٰ کے اجتماع میں دورے کے تاثرات پیش کئے گئے۔ نائب امیر جماعت جناب محمد جعفر نے دو اہم اجتماعات کی نگرانی کی۔

حلقہ جنوبی آسام کے دو علیحدہ تربیتی پروگرام میں بھی سکریٹری مرکز نے شرکت کی اور نائب امیر جماعت جناب محمد جعفر نے نگرانی کی۔ حلقہ کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں دونوں مرکزی ذمہ داروں نے شرکت کی اور تربیتی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔ جناب عبدالباسط انور نے تصنیفی اکیڈمی کے سکریٹری کی حیثیت سے بعض کتابوں کو اشاعت کے لئے اور کچھ کتب کے مسودات کو ماہرین کے آراء کے حصول کے لئے روانہ کیا۔ انگریزی زبان میں نئے لٹریچر کی تیاری کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے۔

سکریٹری شعبۂ رابطہ عامہ جناب اعجاز احمد اسلم نے بنگلور میں FDCA کے زیراہتمام فرقہ پرستی اور فاشزم کے موضوع پر منعقدہ پروگرام میں شرکت کی۔ موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لٹریری کلب کے زیراہتمام منعقدہ پروگرام میں بھی شرکت کی۔ فلسطین میں اسرائیلی مظالم کے خلاف اقدام کے لئے نئی دہلی میں مقیم ملیشیا کے سفیر سے دیگر ملی قائدین کے ساتھ ملاقات کی۔ سکریٹری تعلیم جناب محمد اشفاق احمد نے جناب سید شہاب الدین کے ساتھ ریزرویشن کنونشن کے سلسلے میں CPI کے رہنما جناب اے بی بردھن سے ملاقات کی۔ معاون سکریٹری شعبۂ رابطہ عامہ جناب رفیق احمد نے بھی سیاسی، سماجی اور میڈیا کے ذمہ داران سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

نائب امیر جماعت جناب صدیق حسن نے بتایا کہ APCR کی مختلف سرگرمیاں جاری ہیں۔ چنئی میں عمائدین شہر کی ایک میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ ایک مسجد اور ایک یتیم خانے کی تعمیر کے لئے اہل خیر کی جانب سے پیش کش موصول ہوئی۔ اسکول بیگ اسکیم میں بنگال، بہار، آسام شمال اور یوپی مغرب میں ایک ایک لاکھ روپے غریب طلبہ میں تقسیم کئے گئے۔ Bright Future - Disaster Management کا رجسٹریشن ہوگیا، اس کی جنرل باڈی کی میٹنگ بھی ہوئی جس میں والنٹیئر کور بنانے، ڈساسٹر مینجمنٹ کے لئے ضروری کٹ تیار کرنے اور والنٹیئرس کو تربیت دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ تنظیمی حلقہ جات کے شعبۂ خدمت خلق کے سکریٹری حضرات کے لئے مرکز جماعت میں دو دن کا ورک شاپ منعقد کیا گیا جس میں تمام حلقوں کے سکریٹری حضرات نے شرکت کی۔ جناب محمد اشفاق احمد سکریٹری شعبۂ تعلیم نے رپورٹ پیش کی کہ نصاب کے لئے ہندی اور انگریزی کتب کی بھی تیاری کا کام جاری ہے۔ مہاراشٹر، آندھراپردیش، اترپردیش مشرق، دہلی اور AIITA کے تعلیم سے متعلق امور میں رہنمائی اور تعاون کیا گیا۔

جناب محمد اقبال ملا نے امیر حلقہ مہاراشٹر جناب نذر محمد مدعو اور دیگر رفقاء کے ساتھ پونا میں شیودھرم کے رہنما جناب وجے تھوبے اور جناب ہری نرکے سے ملاقاتیں کیں اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی۔ بامسیف (Bamcef) کے ۹ مقامی ذمہ داران سے بھی ملاقات ہوئی اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے ذریعہ پسماندہ اور کمزور طبقات کو اوپر اٹھائے جانے کے پہلو کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جناب اقبال ملا نے بتایا کہ شعبہ دعوت کے ذریعہ چار دعوتی سی ڈیز تیار کروائی گئی ہیں۔ شعبۂ ملی وملکی مسائل کی جانب سے مرکز میں مرکزی سیاسی کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں آئندہ پارلیمانی انتخابات کے پیش نظر مختلف امور پر غور ومشورہ کیا گیا۔ ناگپور میں AIITA کی کل ہند میٹنگ کے انعقاد میں تعاون کیا گیا۔ مدھیہ پردیش حکومت کی جانب سے اسکول کے طلبہ میں سوریہ نمسکار کروانے کے سلسلے میں حلقہ ایم پی کے جماعتی ذمہ داروں کو دیگر ملی شخصیات کے باہمی تعاون سے ضروری اقدام کرنے کے لئے متوجہ کیا گیا۔ اسسٹنٹ سکریٹری جماعت جناب انتظار نعیم نے تنظیمی ضرورت سے میرٹھ اور لکھنؤ کے دورے کئے۔ ۲۴ر تا ۲۶رجنوری مرکز جماعت میں مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا جس میں ملک کے مختلف مقامات سے ارکان شوریٰ نے شرکت کی۔ قیم جماعت جناب نصرت علی نے ۵ تا ۷رجنوری حلقہ مغربی بنگال کا دورہ کیا اور وہاں مختلف تحریکی امور انجام دیئے۔ کولکاتہ کے امرائے مقامی کی نشست میں کاموں کا جائزہ لیا اور ضروری مشورے دیئے۔ قیم جماعت نے حلقہ مغربی بنگال کی مجلس شوریٰ کے اجلاس اور بنگلہ اسلامی پرکاشن کی میٹنگ میں بھی شرکت کی۔ امیر جماعت مولانا سید جلال الدین عمری نے ۳۱رجنوری کو ملی کونسل کے رام لیلا میدان میں منعقدہ سیاسی بیداری کانفرنس میں شرکت کی اور شرکاء کو خطاب کیا۔

مولانا فضیل قاسمی کے انتقال پر امیر جماعت کا اظہار تعزیت

نئی دہلی- معروف ملی رہنما، نامور عالم دین اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا فضیل احمد قاسمی کی رحلت پر امیر جماعت اسلامی ہند مولانا جلال الدین عمری نے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم اپنے اخلاص، ملی، درد، جذبہ ہمدردی وخدمت کے لئے دیر تک یاد رکھے جائیں گے۔ اپنے ایک بیان میں امیر جماعت نے کہا کہ مولانا فضیل صاحب اپنی نرم مزاجی اور خوش خلقی کی بنا پر مسلم اور غیرمسلم حلقوں میں برسوں سے معروف تھے۔ وہ ہر ایک سے خلوص سے ملتے تھے اور لوگ بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مولانا فضیل قاسمی شخصی طور پر بھی ان سے تعلق خاطر رکھتے تھے اور کبھی اس کا اظہار بھی فرماتے تھے۔

امیر جماعت نے مولانا فضیل صاحب کے کردار کی بلندی اور ملی درد کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ گو کہ مولانا مرحوم خود ایک معروف تنظیم کے ذمہ دار تھے لیکن جب بابری مسجد کی شہادت کے ساتھ ہی حکومت کی جانب سے جماعت اسلامی ہند پر بھی پابندی عائد کئے جانے کا غیرمنصفانہ اقدام کیا گیا تو مولانا فضیل قاسمی صاحب نے جماعت کے مقدمے کی اپنی جانب سے پیروی کی پیشکش کی، جس پر ذمہ داران جماعت نے ان سے اظہار تشکر کیا اور اپنے مقدمے کی سپریم کورٹ میں خود ہی پیروی کی۔

مولانا عمری نے مولانا فضیل صاحب کے لئے مغفرت اور اہل خاندان کو صبر جمیل عطا کرنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ واضح رہے کہ مولانا کے انتقال پر مرکز جماعت کے ذمہ داران نے مرکزی جمعیۃ کے ذمہ داران اور اعزہ سے اظہار تعزیت کیا تھا۔

اظہار تعزیت

نئی دہلی- انجمن اُردو، دوست کانفرنس نے مولانا فضیل احمد قاسمی کی وفات پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ انجمن اُردو، دوست کانفرنس کے کنوینر ایاز محمود نے کہا کہ مولانا فضیل احمد قاسمی ملت کے بہترین دوست اور بہی خواہ تھے۔ اور انہوں نے خود کو قوم کے لئے وقف کردیا تھا اور آخری ایام تک دین کی خدمت پر مامور رہے۔

حقوق نسواں حضور عالم کے ارشادات وکردار کی روشنی میں

(ڈاکٹر مرضیہ عارف، بھوپال)

حضور انور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی بعثت کے وقت پورا عالم اور خاص کر جزیرۂ نما عرب گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا چہار طرف فسق و فجور، جہالت وگمراہی اور وحشت وبربریت کا دور دورہ تھا تہذیب واخلاق امن وانصاف اور محبت واخوت کا دور دور تک نشان نہ تھا حقوق انسانی بے دردی سے پامال کئے جارہے تھے، جہالت وگمراہی کا سب سے بڑا نشانہ عورت کی ذات بنی ہوئی تھی، لڑکیاں پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کردی جاتی تھیں۔ عورتوں کو پیر کی خاک سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا ایک مرد اپنے پاس لاتعداد عورتیں جمع کرلیتا تھا اور موت کے بعد یہ تمام عورتیں مال و جائیداد کی طرح ترکہ کے طور پر اس کی اولاد میں تقسیم ہوجاتی تھیں عورت کا نہ تو ماں باپ کی وراثت میں حق تھا، نہ ہی شوہر کے مال واسباب میں حق تھا اور اس وقت عالم عرب ہی کیا پوری عالم انسانیت اسی بے راہ روی اور گمراہی کا شکار بنی سسک رہی تھیں۔ پوری دنیا میں بیٹیوں کا پیدا ہونا نحوست وادبار کی علامت شمار کیا جاتا تھا۔ مغرب میں تو عورت کے قتل کا جرم بھی قابل سزا نہ تھا۔ ایران میں دو قسم کی بیویاں پائی جاتی تھیں پہلی قسم کی بیویوں اور ان کی اولاد کا جائیداد ترکہ میں حصہ تھا مگر دوسری قسم اس سے محروم تھی، وہاں بیویاں بغیر کسی قباحت کے آپس میں تبدیل کرلی جاتی تھیں۔ ایرانی قانون نے غلام اور عورتوں کی ایک ہی سطح پر رکھ چھوڑا تھا، خود ہندوستان میں عورتوں کو جملہ برائیوں اور ناآسودگیوں کا مجموعہ تصور کیا جاتا تھا، عورتوں کے لئے یہ قانون نافذ تھا کہ اگر کوئی عورت صرف لڑکیاں پیدا کرے تو اس سے رشتہ ازدواج منقطع کرلیا جائے، یہاں اونچی ذات کے لوگ عام لوگوں سے کہیں زیادہ عورتیں رکھنے کے حقدار تھے، عورتوں کو ان کے خاوندوں کے مردہ جسموں کے ساتھ زندہ نذر آتش کردیا جاتا تھا۔ ''ستی'' کی اس رسم کو مذہبی روایت کا درجہ حاصل تھا۔

حقوق نسواں کے لحاظ سے اس بدتر اور تاریک دور میں حضرت محمد ہادی برحق اور رحمت عالم بن کر دنیا میں تشریف لائے اور آپ نے عورت کو معاشرہ میں ایک اہم مقام عطا کرکے معاشرہ کا قابل احترام حصہ قرار دیا۔

حقوق نسواں اور اقوال نبوی

رسول پاک نے واضح طور پر فرمایا:

ماں (کی حیثیت سے عورت) کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو عورتوں کے حق میں بہتر ہے۔

دنیا کی اعلیٰ ترین نعمت ایک نیک اور صالح بیوی ہے۔

لڑکیوں سے نفرت نہ کرو میں خود لڑکیوں کا باپ ہوں۔

جس کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو فرشتے آکر سلام کرتے ہیں اور لڑکی کو اپنے پروں کے سایہ میں لے لیتے ہیں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس ناتواں و کمزور جان کی جو شخص پرورش کرے گا قیامت کے دن خدائے پاک اس کا مددگار رہوگا۔

جس شخص نے بیٹیوں کی جوانی تک پرورش کی تو روز قیامت وہ اور میں دو ملی انگلیوں کی طرح ساتھ ہوں گے۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ رسول خدا نے عورت کو طلاق لینے کا حقدار بنایا اسے باپ بھائی اور شوہر کو باعث ثواب بتایا، اسے باپ بھائی اور شوہر کے ترکہ ومال میں حصہ کی خوشخبری سنائی، مہر کو عورت کا حق قرار دیا، اور سب سے بڑھ کر انسانیت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عورت کو ایک ذمہ دار اور قابل احترام ہستی قرار دیا، مگر اسی کے ساتھ عورت کو مرکز نسوانیت سے ہٹنے نہ دیا بچوں کی پرورش وتعلیم کے ساتھ گھر کا اسی کو محافظ بتایا۔ حضور نے عورتوں کو آرائش وزیبائش کی بھی تعلیم دی۔ آپ ان قریشی عورتوں پر اکثر فخر فرمایا کرتے تھے۔ جو اپنا گھر بار سلیقہ اور خوش اسلوبی سے چلاتی تھیں حضرت ام سنانؓ بیان کرتی ہیں کہ ''جب میں مسلمان ہوئی تو نبی نے میرے ہاتھوں میں مہندی اور چوڑیاں نہ دیکھ کر فرمایا کہ تم عورتوں کے لئے تو یہ کچھ مشکل نہیں کہ اپنے پیرہن رنگ لیا کرو اور ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لیا کرو خواہ وہ چمڑے ہی کی ہوں۔''

آج دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن میں عورتوں کے حقوق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور ان کو پوری آزادی حاصل ہے مگر مغرب میں عورت کی آزادی ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ عورت دن بدن اپنی نسوانی خصوصیات اور دلکشی کھوتی جارہی ہے، مردوں کے مشاغل اور طور طریقے اختیار کرکے عورت نہ تو عورت رہی اور نہ ہی مرد بن سکی ہے بلکہ اپنی تمام فطری رعنائیوں کو گنوا بیٹھی ہے۔ حضور پاکؐ نے عورت کو بہت کچھ عطا کیا اور عورت ہی رہنے دیا یہ بھی آپ کا معمولی احسان نہیں۔ کردار نبوی کے آئینے میں جب حقوق نسواں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے حضرت محمدؐ نے اپنی عملی زندگی سے اس پہلو کو مزید نکھارا ہے آپ کی سیرت کا ایک معمولی طالب علم بھی آپ کی ازدواجی زندگی کی ضیاء پاشی سے اپنی نظریں چرا نہیں سکتا، مختصراً چند واقعات پیش ہیں۔

☆ایک مرتبہ حضور پاک کی خدمت میں کہیں سے دعوت کی اطلاع آئی آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ عائشہ بھی آئیں گی میزبان کو تامل ہوا تو آپ نے دعوت قبول نہ فرمائی، یہی معاملہ دو مرتبہ میزبان نے آپ کی شرط منظور کرلی تو آپ نے دعوت قبول فرمائی اس اصرار کے پس پشت آپ کا یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اس دن گھر میں حضرت عائشہؓ کے لئے کھانے کو کچھ نہ تھا اسی لئے آپ کی غیرت نے تنہا دعوت قبول کرنا گوارا نہیں کیا۔

☆ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش مکہ سے آپ نے جن شرائط پر صلح فرمائی، ان سے اکثر صحابہ مطمئن نہ تھے آپ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اب حج کا ارادہ موقوف کیا جائے۔ سب اپنے احرام کھول کر قربانیوں سے فارغ ہوجائیں۔ صحابہؓ نے جواب میں خاموشی اختیار کی اور احرام نہیں کھولے تو آپ متفکر ہوکر خیمہ میں تشریف لے گئے اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے اس واقعہ کی شکایت کی انہوں نے مشورہ دیا کہ پہلے آپ خود احرام کھول کر اپنا اونٹ ذبح کرلیں پھر دیکھئے اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔ نبی نے ایسا ہی کیا چنانچہ تمام صحابہ نے آپ کی تقلید کی۔ اور ایک اہم مسئلہ ام المومنین کی فراست سے حل ہوگیا۔

☆پیغمبر اسلام نے میاں بیوی کے درمیان خوشگوار تعلقات پر زور دیا ہے۔ آپ کا فرمان ہے کہ اپنی بیوی کو خاموش اور نجیدہ دیکھ کر دل بہلانے والی شگفتہ گفتگو کرو، نبی کریم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اکثر ایسے مواقع پر ازواج مطہرات سے مذاق کیا اور ان کا دل بہلایا، ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ نے مذاقاً دوڑ کی شرط لگائی جس میں وہ آگے نکل گئیں کافی عرصہ بعد دوسری مرتبہ پھر ایسا ہی ہوا تو حضور پاک آگے نکل گئے اس وقت آپ نے فرمایا کہ چلو پچھلی مرتبہ تم جیت گئی تھیں تو اس بار میں حساب برابر ہوگیا۔

☆ایک مرتبہ آپ عورتوں سے محو گفتگو تھے کہ حضرت عمرؓ آگئے عورتیں ان کی آواز سن کر پردہ میں ہوگئیں تو حضور مسکرادیے حضرت عمرؓ آپ کی مسکراہٹ دیکھ کر کھل پڑے اور عورتوں سے کہا کہ تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم نبی سے بلند آواز سے گفتگو کرتی ہو اور مجھ سے بھاگتی ہو۔ عورتوں نے حضرت عمرؓ کی سختی اور حضور کی نرمی کی طرف اشارہ کیا، جس پر ایک بار پھر حضور مسکرادیے۔

☆ سرور دو عالم کے عورتوں پر خصوصی احسانات ہیں اگر آپ عورتوں کے بارے میں مسلسل حسن سلوک کی تاکید نہ فرماتے تو عورت کو یہ مقام کبھی میسر نہ آتا، آپ نے اپنے آخری خطبہ ''حجۃ الوداع'' کے موقع پر عورتوں کی بابت صراحت سے فرمایا:

''میں تم کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی خاص وصیت کرتا ہوں تم میری اس وصیت کو یاد رکھنا دیکھو وہ تمہاری نگرانی میں اور تمہارے قبضہ میں ہیں''

دنیا میں عالم انسان اپنی خانگی زندگی کو راز میں رکھنا پسند کرتے ہیں لیکن محمدؐ کا یہ اعجاز ہے کہ آپ کی طرف سے اس کی عام اجازت بلکہ ترغیب تھی کہ اندرون خانہ کے حالات کو بھی عام کیا جائے اور اسکی پیروی ہو، یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم کی ذاتی زندگی کی عام تفصیلات سب کو معلوم ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی عام انسان کی طرح گھر میں رہتے اور وہ گھریلو کام جو عام انسان کرتے ہیں آپ بھی بلاتکلف اپنے گھر میں کرلیا کرتے تھے حتیٰ کہ اگر کپڑوں میں جوئیں ہوجائیں تو ان کو بھی نکال لیتے تھے اپنی بکری کا دودھ دوہ لیا کرتے تھے، ایک روایت میں آتا ہے کہ اپنے کپڑوں میں پیوند خود لگالیتے تھے اور جوتا درست کرلیتے، اپنے اہل خانہ کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے، گھر والوں کے ساتھ نہایت اخلاق ونرمی سے پیش آتے۔

اسی طرح نبی پاکؐ کو اپنی بیٹیوں کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی اور ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ آپ کی لخت جگر حضرت فاطمہ کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ جب وہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو رسول پاکؐ پیش قدمی فرماکر استقبال کرتے، ان کو اپنی جگہ بٹھاتے، دوسری صاحبزادیوں کے ساتھ بھی آپ کا رویہ یہی تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حضور پرنورؐ کی حیات طیبہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو عام انسانوں کے لئے مشعل راہ نہ ہوتا ہم عورتوں کے ساتھ آپ کا حسن سلوک تو اس قابل ہے کہ دوسری اقوام کے ساتھ اہل اسلام بھی اس کو پیش نظر رکھیں اور عمل پیرا ہوں تاکہ ان پر اپنی عورتوں کے ساتھ بدسلوکی جو الزام لگایا جاتا ہے یا معاشرتی مسائل میں مسلمانوں سے جو عام غفلت ہورہی ہے اس کا سدباب ہوسکے۔ ●●

تہذیبوں کے درمیان ہم آہنگی

سید جمال اللہ قادری

سچ تو یہ ہے کہ تہذیبوں میں ہم آہنگی کی ذمہ داری تنہا کسی ایک فرقہ کی نہیں۔ تہذیبوں کے مابین ہم آہنگی کے کیا امکانات ہیں اور یہ کس طرح ممکن ہوسکتی ہے؟ یہ کام بطور خاص مذہبی اور سماجی کام کرنے والے ادارے یا ممالک جو انسانیت دوست ہوں وہی کرسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دوسرے کو صحیح طور پر واقف کرانے کی آج تک کسی نے سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی۔ اس صدی کا سب سے بڑا کارنامہ مملکت سعودی عرب کے فرمانراں خادم الحرمین شریفین شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے اس جانب پیش رفت کرکے انجام دیا۔ کیونکہ مہذب دنیا میں یہ اصول تسلیم شدہ ہے کہ محبت، احترام و اعتماد اور امن وسکون کے ساتھ رہنے اور نیک مقاصد کے لیے ایک دوسرے سے تعاون و اشتراک کرنے کے لیے ایک دوسرے کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا اور شبہات کا ازالہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اس قسم کی ملکوں اور مذہبی علماء کے مابین گفتگو میں اس بات کا ادراک کیا جاسکے گا کہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش حال اور پرمسرت زندگی گزارنے میں کن جذبات واحساسات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ جو بقائے باہم Co-existence کے لیے لازمی جز تصور کیے جاتے ہیں۔ ساری دنیا میں جس رنگارنگ تہذیب پر ناز کیا جاتا ہے وہ ہے ''جیو اور جینے دو'' کا اصول۔ موجودہ دور میں انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے دنیا ایک چھوٹا سا قریہ Global village بن گئی ہے۔ جس میں دور دراز کے ملکوں کے مذاہب تہذیبوں، زبانوں اور ثقافتوں کے علاوہ عادات واخلاق، شوق اور ہابیز (hobbies) کھیلوں اور تفریحات، کھانوں اور لباسوں کی باریکیوں سے واقف ہونے کا رجحان عام ہوگیا ہے جس سے ایک خوشگوار فضا اور باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسے میں بین المذاہب شکوک اور تلخیوں کا پیدا کیا جانا انسانیت کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہورہا ہے۔ اس نقصان کے پہنچانے میں بعض شدت پسند مذہبی عناصر تو شامل ہیں ہی، لیکن آج کے میڈیا کا رول ان سے زیادہ غیر ذمہ دار مانا جاتا ہے۔ رائی کا پربت بنانا، نہ تو عقل سلیم کا تقاضا ہے اور نہ ہی عقل عملی (Practical wisdom) کا۔ میڈیا کے ادارے اگر یہ طے کرلیں کہ وہ کسی مخصوص فرقہ کی مخالفت نہیں کریں گے یا کم از کم غیر جانبداری اختیار کرلیں گے تو تہذیبوں کے درمیان ہم آہنگی کے امکانات 80 فیصد سے زیادہ ہوسکتے ہیں۔

معاشرے، مذاہب و ثقافتوں کے اختلاف کے باوجود ایک مشترکہ تہذیب اختیار کی جاسکتی ہے۔ مذہب وعقیدہ میں شدید اختلاف کے باوجود جاپانی اور یہودی اہل مغرب کے ساتھ ان کی تہذیب میں برابر کے شریک ہیں۔ مغربی تہذیب کے صالح اجزاء اور وسائل وعلوم جدیدہ کے آہن کو اپنے یقین کی گرمی سے پگھلا کر اپنی تہذیب کے سانچے میں ڈھالیں اور اپنی ضرورت اور اپنے ڈھب کے سانچے تیار کریں۔ یہ عقلی اور ثقافتی نہر اگر وجود میں آجاتی ہے تو وہ دنیا کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ جس کو جدید تاریخ میں سب سے اولین اور نمایاں جگہ ملے گی۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب علوم عصریہ کو صحیح طور سے ہضم کیا جائے، ان کو مزید تقویت کا باعث بنایا جائے اور اس اہم کردار کے لیے ان کو کام میں لایا جائے جس کی سہولتیں اور ذرائع میسر ہیں۔

ہندوستان اور دیگر ممالک میں سیکولرزم کے نام پر انٹرفیتھ شادیوں کی لہر ایک خطرناک رجحان ہے۔ گوکہ ظاہری طور پر اس سے مذہبی آہنگی نظر آتی ہوگی۔ لیکن یہ مذہبوں اور قوموں کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی اور آگے چل کر ایسی دشواریوں اور مسائل سے دوچار ہوگی کہ جن کا کوئی حل نہیں ہوگا۔ مذہب سے بے راہ روی تو اس کا ایک یقینی پہلو ہے لیکن دونوں مذاہب کے ماننے والوں میں تصادم بھی ناگزیر ہے۔ سیکولرزم کے نام پر اس کی حوصلہ افزائی درحقیقت مذہبی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی جسے دونوں ہی مذاہب والے ناپسند کریں گے۔ بین مذہبی (انٹرفیتھ) شادیوں کا رواج کس حد تک کامیاب ہوسکتا ہے؟ اس سے اجتناب اور حوصلہ شکنی کے لیے ضروری اقدامات کرنا قوم وملت کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ انٹرفیتھ شادیوں کے اس فتنہ کو ختم کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کیونکہ اس سے آنے والی نسلوں کی تباہی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم دین اسلام کی تبلیغ اور اس کی بقاء کی جہد کریں اور لوگوں کو اس کی دعوت دیں اپنی آنے والی نسلوں کی اصلاح کے لیے قدم اٹھانا ضروری ہوگا ورنہ بقول مجاز کہ:

سب کا تو مداوا کرڈالا اپنا ہی مداوا کرنہ سکے
سب چاک گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

محمد اسد نے اپنی کتاب روڈ ٹو مکہ (Road to Makkah) میں لکھا ہے کہ علم نہ مغربی ہے نہ مشرقی۔ علمی انکشافات و تحقیقات ایک ایسے سلسلے کی کڑی ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں اور جس میں تمام بنی نوع انسان برابر کے شریک ہیں۔ ہر عالم اور سائنٹسٹ انہی بنیادوں پر اپنی تحقیق کو آگے بڑھاتا ہے جو اس کے پیشروؤں نے کی ہوں خواہ وہ کسی قوم یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن کو اختیار کرنے میں سوجھ بوجھ اور عقل سلیم درکار ہے ورنہ اس کے کسی حد تک خطرناک ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ صورتحال میں اسلام مغرب کی دریافت کردہ سائنس وٹکنالوجی، ایجادات یا سہولت کے دیگر وسائل کو مطلقاً حرام بھی نہیں کہتا۔

اسلام ہمیشہ سے وسیع الذہن رہا ہے اور ہر صالح اور مفید چیز کے استعمال میں فراخ دل اور کشادہ چشم رہا ہے۔ لیکن اس میں جس احتیاط کی ضرورت کو مقدم رکھا گیا وہ ہے مغربی تہذیب کی بنیاد۔ پوری زندگی کو مغربی رنگ میں ڈھالنا اور اس کی مکمل اتباع جو اسلامی طرز حیات کو شریعت، طہارت و نظافت کی روح سے بیگانہ کردے، ایسی بے راہ روی سے پرہیز کی ضرورت کو اسلام نہایت ناگزیر بتاتا ہے۔ اسلام موجودہ صورتحال میں کیا مشورہ دے سکتا ہے؟ میرے خیال میں موجودہ دور میں اسلام کا یہی مشورہ ہوسکتا ہے کہ بعض مادی، سائنسی اور اقتصادی علوم میں جہاں مغرب نے ترقی حاصل کی ہے اس سے استفادہ کیا جائے اور قرآن وسنت کے ذریعہ جو روشنی اسلام کو ملی ہے اس روشنی کا ان علوم میں اضافہ کرکے یہ پیغام دیا جائے کہ اگر اسلام کو مغرب سے کچھ حاصل کرنے کی ضرورت ہے تو مغرب کو بھی اسلام سے بہت کچھ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی باہمی کوششوں کے نتیجہ میں ایک ایسا حسین امتزاج پیدا ہوسکتا ہے جس کا احترام وتقلید کرنے پر ساری دنیا مجبور بھی ہوجائے گی اور سکون وچین کی زندگی بھی بسر کرسکے گی۔

مغربی تہذیب کے اثرات اور تصادم کے سلسلے میں علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کے کمزور پہلوؤں کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور اس فساد تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے علامہ اقبال جنہوں نے مغرب کے افکار وخیالات کو ان میں ایک عرصے تک رہ کر ایک سچے دردمند اور مفکر اسلام کے طور پر محسوس کیا اور کون کرسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اخلاقی وروحانی اقدار سے اہل مغرب کی بغاوت کی وجہ سے مادی رجحان ان کے خمیر میں شامل ہوگیا۔ وہ کہتے ہیں:

فساد قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

ایک اور جگہ علامہ اقبال مغربی تعلیم اور اس کے تمدن کے روشن چہرہ اور تاریک دل کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:

یہ علم و حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری وعریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہے فرنگی مدنیت کی فتوحات

اگر مغربی تہذیب اور اس کے وسائل و ثمرات سے استفادہ باقاعدہ سوچی سمجھی اسکیم، بصیرت اور تدبر، خیر وشر کی بنیاد پر نہ ہوا تو یہ تہذیب ساری دنیا پر جبراً قابض ہوجائے گی۔ عوام گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ساری اخلاقی ودینی قدریں فنا ہوجائیں گی۔ پھر مذہبی قائدین اور رہنما اس صورتحال کے سامنے بے دست وپا اور مفلوج نظر آئیں گے اور ان کے ہاتھ سے زمام قیادت ہمیشہ کے لیے نکل چکی ہوگی۔ ●●

میڈیا کو اصول وضوابط کا پابند بنانا ضروری

ابو الکرم عرفان

ذرائع ابلاغ کی اہمیت آج کے انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں بہت بڑھ گئی ہے اور آج کے دور کو بجا طور پر ٹکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میڈیا نے اہمیت اختیار کرلی ہے جس کو حکومت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ میڈیا عوام کی رائے بنانے اور اس کی تعمیر وتخریب میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس کا سحر اس قدر ذہنوں پر چھا جاتا ہے اور اس کی دی ہوئی خبروں کو اس طرح قبول کیا جاتا ہے کہ جیسا کہ وہی کھلا سچ ہے۔ آج میڈیا اس حد تک بے قابو ہوگیا ہے کہ اس کا انداز من مانی کا ہے۔ بات اس انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ ہم جو کچھ پیش کررہے ہیں اس کو سچ کی حیثیت سے مان لیا جائے۔ ممبئی کے حالیہ واقعات کے سلسلے میں بعض معقول اور حقیقت پر مبنی سوالات کیے گئے مگر اس کو اس لیے رد کردیا گیا کہ وہ کچھ لوگوں کے نزدیک قوم و ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔ ٹی وی دیکھنے والوں کو روز اول سے یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ محض 10 دہشت گرد ایک وسیع علاقے کو کیسے یرغمال بنائے ہوئے تھے اور وہ بھی 60 گھنٹے تک۔ CST اسٹیشن سے تاج محل ہوٹل تک کی وسعت قابل لحاظ ہے۔ ان دہشت گردوں میں سے 9 مار ڈالے گئے اور ایک کو پکڑلیا گیا جو اجمل قصاب کی حیثیت سے شناخت کیا گیا۔ ان 9 دہشت گردوں کی کوئی شناخت نہیں بتائی گئی کہ آخر یہ کون تھے اور کہاں سے ان کا تعلق تھا۔ ظاہر ہے انٹلی جنس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ اس سے ضرور واقف ہوں گے مگر مفاد عامہ میں شاید انہوں نے بتانا ضروری نہ سمجھا کہ کہیں اس سے قومی سلامتی کو خطرہ لاحق نہ ہو مگر یہ نہیں سوچا گیا کہ اس سے ذہن غلط رخ پر بھی سوچ سکتا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ اس کارروائی میں مقامی افراد بھی شامل رہے ہوں گے کیونکہ اتنا بڑا کام بیرونی اور ایک قلیل تعداد انجام نہیں دے سکتی۔ ادھر مرکزی وزیر عبدالرحمٰن انتولے نے جو سینئر کانگریسی قائد ہیں ایک چبھتا ہوا اور معقول سوال اٹھایا کہ ہیمنت کرکرے جس نے ہندو دہشت گردی کو بے نقاب کیا تھا اور جس کو چند روز دھمکیاں دی جارہی تھیں کس طرح گڑبڑ زدہ علاقے سے بلاکر اسپتال کے پاس ان کے دو ساتھیوں سمیت گولی ماردی گئی۔ انہوں نے اس کی جانچ کا مطالبہ کیا کہ یہ کون لوگ تھے جنہوں نے ان کو ادھر بلایا۔ یہ بھی سوال قابل غور ہے کہ ان کو مارنے والے ان کے جاننے والے ہی ہوں گے۔ ٹی وی نے مسلسل تین چار دن اس سلسلہ میں جو تشریات پیش کیں اور جس غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا اس بات کا متقاضی ہے کہ میڈیا کو بھی ضابطہ کا پابند بنایا جائے اور اس کو بھی محاسبہ کے لیے جوابدہ ہونا چاہیے۔ وہ اگر مادر پدر آزادانہ انداز میں کام کرنے لگے تو یہ ملک کے حق میں بہتر نہ ہوگا۔ ارباب حل وعقد کو میڈیا کے موجودہ رول کے سلسلے میں غور کرنا چاہیے کہ اس کو کس طرح ضابطہ اخلاق کا پابند کیا جائے۔

وائٹ ہاؤس میں سیاہ فام صدر

امریکی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ وائٹ ہاؤس میں ایک سیاہ فام صدر کی حیثیت سے جلوہ افروز ہے۔ اس وقت سیاہ فام امریکیوں کی جدوجہد یاد آرہی ہے جو مارٹن لوتھر کنگ کی قیادت میں لڑی گئی کہ انہیں برابر کے حقوق دیے جائیں اور ان کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائے۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ سیاہ فاموں کے ہوٹل الگ تھے، ان کے لیے دوکانیں اور مقامات تفریح تک الگ تھے وہ کسی طرح سفید فاموں کے ساتھ گھل مل نہیں سکتے تھے۔ اس وقت مارٹن لوتھر کنگ نے کہا تھا کہ مستقبل میں، میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم امریکہ میں اس امتیازی سلوک کو اپنے اتحاد وجدوجہد سے ختم کردیں گے۔ ان کی یہ پیشنگوئی پوری ہوئی اور آج ایک سیاہ فام صدر کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے۔ لوگوں نے اس سیاہ فام صدر سے بہت سی امیدیں وابستہ کررکھی ہیں۔ اس کا اس قوم سے تعلق ہے جو کبھی دبی کچلی گئی تھی اور ناانصافی، ظلم و جارحیت کا شکار ہوئی۔ توقع ہے کہ نیا صدر اپنے دور صدارت میں عدل وانصاف سے کام لے گا۔ جمہوریت، مساوات اور حقوق انسانی کا پورا پاس ولحاظ رکھے گا۔ مگر کہا جاتا ہے کہ امریکی صدر یہودیوں کے گھیرے میں ہوتا ہے وہ آزادانہ کوئی فیصلہ کرنے کے موقف میں نہیں ہوتا۔ ان چند دنوں میں جو فیصلے اس نے کیے ہیں اس سے اس کی توقع عبث ہے کہ وہ بش کے ڈالے ہوئے راستے سے الگ کوئی راہ نکالے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی فیصلہ اپنی مجبوری اور ملکی مفادات کے تحت انجام دے اور اس کے نتیجہ میں انصاف کا تقاضا پورا ہو۔ مگر وہ تو اس مشن کی تکمیل کرے گا جو اس کے ملک کا ہے کہ امریکی برتری سارے عالم میں قائم ہو اور تمام دنیا کے ذرائع دولت اس کی مٹھی میں ہوں۔ کیونکہ یہ قوم پرستی کا تقاضہ ہے اور ملک اور قوم کی بھلائی اسی میں مضمر ہے۔ اس لیے اس سیاہ فام صدر سے غیر ضروری توقعات وابستہ رکھنا صحیح نہیں بلکہ ٹھہر کر انتظار کریں کہ واقعی وہ ظلم وجارحیت وتشدد کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے یا اس کے جواز کے لیے بش ہی کی طرح کی دلیلیں فراہم کرتا ہے جو جاتے جاتے اس نے بطور اعتراف اس نے بطور اعتراف کہی تھیں کہ وہ جھوٹی تھیں جس پر اس نے اقدام کیا تھا۔

نوجوانوں میں اخلاقی بگاڑ

چند دن قبل منگلور کے ایک شراب خانے (Pub) میں رام سینا کے کارکنوں نے حملہ کرکے اس میں موجود خواتین کے ساتھ مار پیٹ کی اور انہیں زبردستی اس سے نکالا۔ ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تیزی سے مغربی کلچر سے متاثر ہورہے ہیں۔ اس کو روکنے کا یہ طریقہ زیادتی پر مبنی ہے۔ کسی برائی کو روکنے کے لیے سب سے پہلے اس کو برائی ہونا بتایا جائے اور تعلیم وتربیت کے ذریعے اس سے دور رہنے کی تلقین کی جائے۔ انسان خواہشات کا اتنا غلام ہوتا ہے کہ وہ اپنے جسمانی اور اخلاقی نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ پہلے ان ذرائع پر پابندی لگائی جائے جو اس برائی کے پھیلنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ماحول کو پاکیزہ اور مبنی بر اخلاق بنانا پڑے گا اور اس کے بعد کوئی سخت قانون نافذ کرکے اس پر روک لگانی ہوگی۔

موجودہ صورتحال میں کتنا ہی نیک مقصد ہو اس کو غنڈہ گردی سمجھا جائے گا، جیسا کہ کہا جارہا ہے، قانون کو ہاتھ میں لینا کسی فرد یا جماعت کا کام نہیں ہوتا اس سے اصلاح کے بجائے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس مسئلے کو خالص اخلاقی پہلو سے دیکھنے کے بجائے سیاسی نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کا جائزہ لیا جارہا ہے کہ کانگریس اور بی جے پی کے تحت ریاستیں اس میں کس حد تک ملوث ہیں۔ ●●

بقیہ: نئی امریکی قیادت سے مسلم دنیا کی توقعات

سے زیادہ اثر انداز نہیں ہوسکے گا۔ لیکن امریکی قوت قاہرہ صرف اپنے وسائل پر قانع کہا ں ہے وہ ان معلنہ رعایتوں کے لیے دنیا والوں پر بوجھ ڈالنے سے بھی باز نہیں آئے گی! اس کا سیدھا مطلب ہے کہ مخالف دہشت گردی جنگ کے اخراجات کی پابجائی کروائی جائے گی جس کے لیے تیسری دنیا موجود ہے۔

مسلم دنیا سے از سر نو مکالمہ کی نوبت آنے پر ہماری قیادت کو تحمل ودانش مندی اور بیباکی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ نام نہاد مخالف دہشت گردی جنگ پر دوٹوک موقف اختیار کرنا چاہیے اور اس جنگ سے خود کو الگ تھلگ کرلینا چاہیے بلکہ جن جنگجو عناصر کی وجہ سے یہ استعماری مہم جوئی طوالت پکڑ گئی ہے ان کا خود ہی سدباب کردینا چاہیے۔ جس طرح حرب فجار خون ریزی کے یکطرفہ اعلان مسدودی سے بند کی گئی تھی اسی طرح جہاں جہاں یہ اب جاری ہے اور امن کی سبیل کے بجائے ایک عمومی فتنہ بن گئی ہے اس کو روک دینا ہی مصالح دین کا تقاضا ہے۔ کیونکہ جب تک یہ جاری رہے گی استعماری طاقت کی مداخلت برقرار رہے گی۔ اس صورتحال کا خاتمہ ضروری ہے۔ عراق وافغانستان اور فلسطین میں اعتدال پسند قیادتوں کو زمام اقتدار سونپنا اور اس عمل میں مسلم دنیا کا موثر کردار نبھانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور کسی مکالمہ سے قبل یہ پیش رفت ہوجانا احسن ہے۔

کیا مسلم دنیا کی قیادت اس چیلنج کو قبول کرسکے گی؟ اور نئی امریکی قیادت سے کوئی نتیجہ خیز مکالمہ کرسکے گی؟ آنے والے حالات کا رخ اس پر منحصر ہوگا۔ ●●

بقیہ: میلاد النبی کا پیغام

تعلیمات نبویؐ کے تابع ہوجائیں۔

میلاد النبی کے موقع پر مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے کہ ان کی آبادیوں میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور تعلیمات سے واقف نہیں ہیں۔ اب اہل ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ برادران وطن کو اسلامی تعلیمات اور اسوۂ رسول ﷺ سے واقف کرائیں۔ برادران وطن کے ایک ایک فرد، مرد و عورت سے ملیں، روابط پیدا کریں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور تعلیمات پر مبنی لٹریچر ان تک پہنچائیں۔ یہ کام محلوں میں ہو، دفاتر میں ہو، اسکولوں میں ہو، کالجوں میں ہو، صنعت وتجارت کی منڈیوں میں ہو۔ آئی ٹی کمپنیز میں ہو، غرض یہ کہ ملک کا کوئی فرد چاہے مرد ہو یا عورت میلاد النبی کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے محروم نہ رہ جائے۔ تب جاکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حجۃ الوداع کے موقع پر دی ہوئی ہدایت کی تعمیل ہوسکتی ہے: ''ان تک یہ پیغام پہنچا دو جو آج موجود نہیں ہیں''۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر مسلمان اہل علم و دانش کا یہ فرض ہے کہ ملک کے قانون دانوں، قانون ساز افراد، پالیسی ساز افراد، حکمرانوں اور صنعت و تجارت اور میڈیا کی بااثر ہستیوں سے خصوصی ملاقاتیں کریں اور دوٹوک انداز میں انہیں بتلائیں کہ ملک میں امن چین، سکون، مسرت اور خوشحالی صرف اسی وقت آسکتی ہے جبکہ خالق کائنات کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ دلائل کے ساتھ باضابطہ متعین انداز میں موجودہ دور کی خرابیوں کو واضح کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کی حقانیت پیش کی جائے اور انہیں مزید غور وفکر کی دعوت دی جائے۔ اگر یہ سلسلہ باضابطہ چلتا رہا تو کوئی عجب نہیں کہ ملک کی تقدیر بدل جائے۔

میلاد النبی ﷺ کے موقع پر علماء، قائدین، خطباء اور مقررین کی ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے خطابات اور تقاریر میں اتباع سنت اور اطاعت رسول کی ترغیب دیں۔ محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس اور محبت کے اظہار پر بس نہ کریں بلکہ عمل کی جانب ابھاریں اور زندگیوں میں اسوۂ رسولؐ اپنانے کی تلقین کریں۔ حتی المقدور اس بات کی کوشش کریں کہ دیگر فکر وخیال رکھنے والوں پر تنقید یا تنقیص نہ کریں، دیگر تنظیموں اور اداروں پر لعن طعن نہ کریں، کسی پر بھی فتویٰ بازی نہ کریں اور بہرصورت اختلاف و انتشار سے احتراز کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی ہے۔ ●●

POSTED ON 14 February 2009 AT DELHI R.M.S. LICENCE NO. U (D.N.) 41/2006-08 TO POST WITHOUT PRE PAYMENT PAGES-8. ۱۶رفروری ۲۰۰۹ء

TELEGRAM : ADDAWAH NEW DELHI-110025
PHONES: Editor: 26958816, Manager: 26949539, Fax:26958816
E-mail:- dawattrust@yahoo.co.in, dawaturdu@indiatimes.com

DAWAT SEHROZA
NEW DELHI-110025

R.N.I. No.522/57
DL (S) - 05 / 3128 / 2009 - 2011 & DL (S) - 05 / 3266 / 2006-08 (Foreign Post)
POSTAL REGISTRATION No.

ہندوستان کی سیاست اور مسلمان

ڈاکٹر منظور عالم

◎

۲۶، جنوری ۱۹۵۰ء کو ایک خودمختار، جمہوری اور سماج وادی ریاست بن جانے کے بعد ہمارے ملک میں سیاست اور سماجی تشکیل کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ دستور کی رو سے دستور کے دائرے میں ریاست کے سیاسی اقتدار پر دعوے داری کے لئے سیاسی جماعتیں بننا شروع ہوئیں۔ ملک کی آزادی کا سہرا انڈین نیشنل کانگریس کے سر تھا، اس لئے فطری طور پر عوام نے اسے ہی اقتدار کا حق دار سمجھا اور اسے اپنی حمایت دے کر سیاسی نظام کو چلانے کی ذمہ داری سونپی۔ ایک طویل عرصے تک کانگریس پارٹی کو یہ تائید وحمایت ملی رہی اور وہ سیاسی نظام کو چلانے کے منصب پر بلا مقابلہ فائز ہوتی رہی۔ دھیرے دھیرے جب جمہوریت نے رنگ دکھانا شروع کیا اور عوام کو سیاست کے افق پر اپنی پسند اور ترجیح کے متبادل چننے کی اہمیت کا اندازہ ہوا تو کانگریس کے اقتدار کو چیلنج کرنے والی جماعتیں بھی سامنے آنے لگیں۔

کانگریس کا خمیر متحدہ قومیت اور سیکولر جمہوری نظام کے تصور سے اٹھا تھا اور ملک کا سماجی وسیاسی ڈھانچہ اپنی ساخت کے اعتبار سے کثیر ثقافتی، جمہوری اور لبرل بنیادوں پر استوار ہوا تھا، اور سماجی تشکیل کے اس عمل میں کانگریس کا سیاسی رول بہت اہم تھا، اس لئے کانگریس کے اقتدار کو چیلنج کرنے والی متبادل جماعتیں جب اقتدار کی دعوے دار بن کر سامنے آنے لگیں تو بھی، جملہ ہندستانی عوام بالعموم اور اقلیتیں و پسماندہ طبقات بالخصوص کانگریس کو ہی اقتدار کے لئے اہل اور موزوں سمجھتے رہے۔ مگر دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ اس مستقل تائید وحمایت کو کانگریس اپنے لئے ایک ذمہ داری اور امانت سمجھنے کے بجائے عوام کی ایک مجبوری اور اپنے لئے ایک اجارہ داری سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہونے لگی۔ عوام کے جذبات، عوام کی امنگیں اور عوام کی ضرورتیں اسے غیر اہم اور اجنبی لگنے لگیں اور اقتدار کے مزے اسے اہم لگنے لگے۔ لیڈروں اور کارکنوں کے مزاج میں رعونت آگئی اور عوام انہیں بے وقعت لگنے لگے۔ جس کے نتیجے میں اس کے تئیں عوام کی رغبت اور اعتماد میں کمی ہونا شروع ہوئی اور ان حالات کا فائدہ متبادل جماعتوں کو ملنے کے آثار بننے لگے۔

چنانچہ مرکزی سیاست میں اپنی جگہ بنانے کے لئے ہندتو کے عنصر نے سر اٹھایا۔ یہ وہی عنصر تھا، جو تحریک آزادی کے دوران ہندستان کو برہمن وادی دیو مالائی نظام والا ملک بنانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس نے تحریک آزادی میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی، بلکہ اپنے فرسودہ نظریات کو بروئے کار لانے اور اپنی مرضی کا ملک بنانے کی راہ میں تحریک آزادی کو خطرہ سمجھتے ہوئے اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس عنصر نے انگریز سامراج کے ساتھ وفاداری برتنے اور اس سے ساز باز کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کو اپنی حکمت عملی کا حصہ بنایا تھا۔ لیکن ہندستانی عوام کی مشترکہ جدوجہد سے ہندستان بالآخر آزاد ہوا تو اس آزادی اور جمہوریت مخالف عنصر نے خود کو نئے قالب میں ڈھال لیا۔ یہ آزاد ہندستان کی سیاست میں اپنی جگہ بنانے میں لگ گیا اور خود کو ایک متبادل سیاسی قوت بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ چنانچہ ہندتو کے اس عنصر نے جب سر اٹھایا تو کانگریس کی ناعاقبت اندیشی کے نتیجے میں اسے ایک توجہ ملنی شروع ہوگئی۔

راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے پیٹ سے نکلنے والی ہندتو وادی سیاست نے ملک کے کثیر ثقافتی، متحدہ قومی، لبرل اور سیکولر سماجی وسیاسی ڈھانچے کو اپنی تنقید اور سیاسی حملوں کا ہدف بنایا۔ اس نے ''ہندستان ہندوؤں کے لئے'' کا نعرہ لگانا شروع کیا۔ دستوری طور سے ''ہندو'' قرار دئے گئے لوگوں کو اس نے یہ احساس دلانا شروع کیا کہ متحدہ قومیت اور سیکولرازم ایک دھوکہ ہے۔ یہ ملک ہندوؤں کا ہے اس لئے ہندوؤں کو اپنی جداگانہ سیاسی قوت مضبوط کرنی چاہئے۔ چنانچہ اس نے ہندو عوام کے ووٹوں کو بھڑکیلے اور جذباتی نعروں کے ذریعے مرتکز (پولرائز) کرنا شروع کیا۔ ملک میں بسنے والے غیر ہندو فرقوں یعنی مسلمانوں، عیسائیوں، بودھوں اور سکھوں کو ان کی جداگانہ اور مخصوص شناخت سے دست بردار ہوکر ''ہندو کلچر'' میں ضم کرنے کے لئے ظالمانہ اور شاطرانہ ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ لیکن ان فرقوں کی مزاحمت اور اپنی جداگانہ شناخت پر اصرار کی وجہ سے وہ انہیں اپنے اندر ضم کرنے میں ناکام رہے تو انھوں نے ان کے خلاف ایک مستقل محاذ جنگ کھول دیا۔ غیر ہندو اقلیتی فرقوں میں سب سے بڑا فرقہ مسلمان ہے اور اپنی جداگانہ شناخت پر اصرار میں یہ سب سے زیادہ پرجوش اور ثابت قدم بھی ہے، اس لئے ہندتو وادیوں کے جارحانہ حملوں کا سیدھا نشانہ بھی یہی فرقہ بنا۔ مسلمانوں کے خلاف فسادات برپا کرنا، ان کی املاک تباہ کرنا، ان کی اقتصادیات کو نقصان پہنچانا اور ان کے لئے قدم قدم پر مسائل پیدا کرنا اس ہندتو وادی عنصر کا ایک مستقل مشغلہ رہا ہے۔ سکھوں اور عیسائیوں کو بھی اس نے سبق سکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ہندتو وادی جارحیت کو شروع میں تو ایک لمبے عرصے تک صرف مسلمانوں کے خلاف سمجھا جاتا رہا اور اسے ہندو مسلم کشمکش سمجھا گیا، لیکن ۱۹۸۴ میں سکھوں کے خلاف ہوئے فسادات نے سکھوں کی آنکھیں کھول دیں اور اس کے بعد عیسائیوں کے خلاف شروع ہوئی مسلسل مہم سے عیسائی بھی اس حقیقت کو جان گئے کہ ہندتو واد کا عفریت سب کو نگل جانا چاہتا ہے۔

اس ہندتو وادی عنصر کو کانگریس کی چشم پوشی اور منھ بھرائی کی وجہ سے تقویت ملتی چلی گئی۔ کانگریس نے درپردہ اسے چھوٹ دی اور بظاہر اس سے بیزاری کا بھی اظہار کرتی رہی۔ اس نے مسلمانوں اور دیگر مظلوم فرقوں کے ساتھ بظاہر تو ہم دردی کا اظہار کیا، ان کو تسلی اور دلاسہ دیا، لیکن ان کے تحفظ کے لئے موثر اقدامات نہیں کئے۔ اس نے مسلمانوں کو چوٹ پہنچانے والے عناصر کو تو نہیں روکا، لیکن مسلمانوں کے زخموں پر مرہم لگانے کا دکھاوا کرتی رہی۔ کانگریس کے سیکولرزم سے مایوس اور جن سنگھ یا بی جے پی کے ہندتو واد سے بے زار عوام کو علاقائی جماعتوں کی شکل میں تیسرا متبادل نظر آنے لگا۔ پہلے جنوبی ہندستان میں اور پھر شمالی ہندستان میں دھیرے دھیرے علاقائی پارٹیوں کا ظہور ہوا۔ جنھوں نے عوام کے بنیادی مسائل کو قومی تناظر سے قطع نظر مقامی اور نسلی دائرے میں حل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ عوام اور ان کے جذبات سے قریب تر ہونے کی بنا پر ان پارٹیوں کو اپنے اپنے دائروں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن بیشتر سیاسی پارٹیاں ذات برادری اور بھائی بھتیجہ واد کی سیاست کرتی رہیں۔ کسی اصول اور سیاسی نظرئے پر جمنے کے بجائے یہ پارٹیاں شخصی پارٹیاں بن گئیں اور پرائیوٹ لمٹیڈ کمپنی کی طرح کام کرنے لگیں۔ ان پارٹیوں نے اپنی ذات برادری کو نام نہاد اونچی ذات کے غلبے سے نکالنے کو اپنا ایجنڈا بنایا اور اس ایجنڈے کے نام پر لوگوں کو متحد کر کے ان سے حاصل ہونے والی قوت کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کیا۔ شمالی ہند میں راشٹریہ جنتا دل، لوک جن شکتی پارٹی، سماج وادی پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی اس سیاسی کلچر کی ہی نمائندہ ہیں۔ اسی طرح آندھرا پردیش میں تیلگو دیشم پارٹی نے اپنی سیاسی زمین ہموار کرنے کے لئے ''کماذات'' کو آواز دی تمل ناڈو میں ڈی ایم کے، اے آئی اے ڈی ایم کے اور پی ایم کے وغیرہ نے بھی یہی کام کیا۔

ان سے الگ ایک تیسری سیاسی طاقت کمیونسٹ پارٹیوں کی شکل میں ابھری۔ یہ پارٹیاں لامذہبیت یا مذہبی غیر جانبداری کے اپنے نظرئے پر اصرار کو ثابت کرنے کے لئے ہندتو وادی براہ راست مخالف رہیں۔ انھوں نے عام آدمی کے مسائل کو اپنی سیاست کی بنیاد بنایا اور سوشل اینڈ اکنامکل ایکوالٹی (سماجی اور اقتصادی برابری) کو ایجنڈا بنایا۔ لیکن ان پارٹیوں کی قیادت پر بھی اس طبقے کی اجارہ داری رہی جو خود کو سوپر سمجھتا ہے اور جسے ذات پات کے طبقاتی نظام میں سب سے اونچی پوزیشن حاصل ہے۔ یہی طبقہ ہندتو واد کا بانی اور محرک ہے اور فرقہ پرستی کے اصل سوتے اسی سے پھوٹتے ہیں۔ چنانچہ اپنی فطرت کے مطابق اس طبقے کی قیادت نے سوشلزم اور ایکولزم کے اپنے سیاسی نظرئے کو کبھی ایمانداری کے ساتھ نہیں برتا۔ مسلمانوں سے بے نیازی اور انہیں نظر انداز کرنے کا رویہ عملاً اس کے یہاں کانگریس یا بی جے پی سے کچھ بھی کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی بنگال میں جہاں اس پارٹی کی حکومت تقریباً تین دہائیوں سے چلی آرہی ہے، اور جہاں مسلمانوں کی آبادی سرکاری ریکارڈ کے اعتبار سے ۲۵ فیصد ہے، وہاں مسلمانوں کی حالت سب سے بری اور پریشان کن ہے۔

یعنی کل ملا کر نتیجہ یہ ہے کہ کسی بھی پارٹی میں اور پارٹی کی حکومت میں مسلمانوں کو بااختیار حصہ داری نہیں ملی ہے۔ کوئی مسلم قیادت ملک کے سیاسی دھارے میں نہیں ابھر سکی ہے۔ کسی بھی ریاست میں یا مرکز میں یا خود پارٹیوں کے اندر پالیسی سازی میں مسلمانوں کا کوئی رول نہیں ہے۔ حکومت کی بیورو کریسی میں، یا وزارتوں میں مسلم چہروں کی نمائندگی تو کسی قدر رہی، لیکن ان کی پیشہ ورانہ خدمات سے ہی ملک اور حکومتوں نے استفادہ کیا، ملک اور ملت کی سطح پر قائدانہ مقام کوئی حاصل نہیں کر سکا۔ چنانچہ مسلمانوں میں مایوسی گھر کرتی گئی اور خود اعتمادی جاتی رہی۔ اور اس کے نتیجے میں وہ مسلسل بڑھتی ہوئی رفتار سے پستی کی طرف جاتے رہے۔ اور آخر کار ملک کا سب سے پسماندہ طبقہ بن گئے۔

ملت کی سطح پر مسلمانوں اور ان کی قیادت سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے قومی دھارے سے الگ رکھنے کی اس شاطرانہ سیاست کا براہ راست مقابلہ کرنے کے بجائے خود کو اپنے داخلی دائرے میں سمیٹ لیا اور اقدامی پوزیشن میں آنے کا حوصلہ پیدا نہ کیا۔ دستور کا ٹھیک سے مطالعہ اور فہم حاصل نہ کیا گیا اور نظام میں اپنی ترقی اور بااختیار ہونے کے امکانات پر حوصلہ مندانہ غور نہ کیا۔ پوری ملت حاشیہ بندی (Ghettoisation) کا شکار ہوگئی اور پارٹیاں اسے محض ووٹ بنک کی حیثیت سے ہی دیکھتی رہیں۔ یہ صورت حال ۶۰، ۷۰ اور ۸۰ کی دہائی تک کم وبیش انداز سے ایک ہی رخ پر بنی رہی۔ ۹۰ کی دہائی میں نئی نسل کے لوگوں کے اندر اس صورت حال کا ردعمل نظر آنے لگا۔ نوجوان بے چینی اور بے اعتمادی میں مبتلا دکھائی دینے لگے، مستقبل کے تئیں مایوسی سے زیادہ فکر مند اور قنوطیت سے زیادہ طیش اور تبدیلی کے جوش میں۔

ردعمل کی اس کیفیت میں چار طرح کی نفسیات سامنے آئیں۔ ایک وہ لوگ جو اپنی قیادت سے متنفر اور بے زار ہوئے، قیادت کو کوسنا اور اس کے تئیں منفی جذبات کا اظہار ان کا مستقل رویہ بنا اور بے عملی ان کا عمل بن گئی۔ دوسرے وہ لوگ ہوئے جنھوں نے سیاسی پارٹیوں پر انحصار کو اپنے مسائل کا حل سمجھا اور ان پارٹیوں سے وابستہ ہونے میں ہی اپنا فائدہ دیکھا۔ پارٹیوں نے انہیں کچھ میٹھی گولیاں کھلا کر خوش کیا اور انہیں ذاتی فوائد کی جھلک دکھا کر قوم کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے انہیں استعمال کیا۔ لیکن یہ لوگ اپنی کوئی پوزیشن وہاں نہیں رکھتے تھے۔ لیڈروں کی چاپلوسی اور ہاں میں ہاں ملانا ہی ان کا کام تھا۔ اگر یہ لوگ مسلمانوں کے مسائل پر کچھ بات کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ انہیں سائڈ لائن کر دئے جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ تیسری طرف وہ لوگ ہوئے جو الیکشن کے زمانے میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ ان میں موقع پرست اور مفاد پرست بھی ہوتے ہیں اور الیکشن کو ایک موقع سمجھ کر کچھ کرنے کا جذبہ رکھنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ بہت سی تنظیمیں اور گروپ اس موقع پر شور مچاتے دکھائی دیتے ہیں۔ چوتھی طرف ملی جماعتوں کے پلیٹ فارم ہیں۔ ان سے وابستہ لوگوں نے ملت کی رہنمائی کی کوشش کی، لیکن مسائل کا گہرائی سے تجزیہ کئے بغیر۔ جس کی وجہ سے مسائل کے حل کے طریقوں پر عموماً جذباتیت کا غلبہ رہا۔ مزید یہ کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا رجحان لوگوں میں رہا اور کچھ دوسرے لوگوں نے برادری اور طبقے کے نام پر کے نام پر ہی سیاست کرنے میں دلچسپی لی۔

●●

انگلینڈ میں انتہا پسند جماعتوں میں پادریوں کی شمولیت پر پابندی

لندن- چرچ آف انگلینڈ کے ارکین نے دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں بشمول برٹش نیشنل پارٹی میں پادریوں کی شمولیت پر پابندی لگا دی ہے۔ چرچ کا یہ اقدام دائیں بازو کی انتہا پسند تنظیموں بشمول بی این پی کے لئے اب اس دعوے کو اور بھی مشکل بنا دے گا کہ انہیں مسیحی علماء یا کلیسائی نمائندوں کی تائید وحمایت حاصل ہے۔ یہ اطلاع ساؤتھ وارک ڈیوسس کے واسانتا ناناوروں نے دی ہے۔ چرچ کے اراکین نے میٹنگ میں اس پابندی کے حق میں اپنی آراء ظاہر کیں جس کا اطلاق مسیحی علماء کے ساتھ ساتھ چرچ کے ترجمانوں پر بھی ہوگا۔ زائد از ۳۰۰-اراکین نے پابندی کے حق میں ووٹ ڈالے جب کہ تیرہ اراکین نے اس کی مخالفت کی۔ اس تجویز کو اب پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ بی این پی کے، جو نسل پرست ہونے سے انکار کرتی ہے، ملک میں درجنوں کونسلر اس کے ممبر ہیں۔ اس پارٹی نے گزشتہ سال لندن اسمبلی میں ایک سیٹ جیتنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ پارلیمنٹ میں اسے نمائندگی حاصل نہیں۔ چرچ کے اقدام پر ردعمل ظاہر کرنے کے لئے بی این پی کے کسی ذمہ دار سے فوری طور پر رابطہ قائم نہیں کیا جا سکا۔

بقیہ: امریکہ میں توسیع پسندی وبالادستی کی پالیسی پرانی ہے

حملوں کی پالیسی اپنائے جانے کے باعث بین الاقوامی قوانین کے احترام کی راہ مسدود ہوگئی۔ عالمی تجارت کا بیشتر انحصار بین الاقوامی قوانین اور تسلیم شدہ اصولوں کے احترام اور پاسداری پر ہے۔ جو لوگ تمام بین الاقوامی معاملات کو عالمگیریت کے اصولوں کے مطابق طے کرنے کی بھرپور وکالت کرتے تھے وہ بھی بش انتظامیہ کی پالیسیوں سے اس قدر دل برداشتہ ہوگئے کہ اقتصادی بحران اور ماحول سے متعلق مسائل حل کرنے کی بین الاقوامی کوششوں سے دست کش ہوگئے۔

کلنٹن انتظامیہ نے دنیا کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ کر لیا ہے کہ ٹیکنالوجیز میں پیش رفت کے ثمرات کو تمام خطوں اور ممالک تک پہنچایا جائے گا اور کسی بھی طور ایسا ماحول پیدا نہیں ہونے دیا جائے گا کہ صرف امریکہ اور یورپ کے بڑے اداروں کو فوائد حاصل ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داروں اور سرمایہ کاروں نے اپنے مفادات کے لئے کئی ممالک، بلکہ خطوں کے مفادات کو بھی داؤ پر لگانے اور متعدد ممالک کو تباہی سے دوچار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ کلنٹن انتظامیہ نے عالمگیریت کی جو شکل اختیار کی اس کے تحت ایک طرف تو ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اپنے حالات کی خرابی کے خود ذمہ دار ہیں اور دوسری طرف طاقتور ممالک کے انتہائی طاقتور کاروباری ادارے تمام فوائد بٹورنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کمزور ممالک کی حکومتوں کو کمزور کرنے کا عمل اب تک جاری ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی شعوری کوشش رہی ہے کہ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو اس قابل ہونے ہی نہ دیا جائے کہ وہ کبھی ترقی کے قابل ہو سکیں یا ترقی یافتہ دنیا کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں آسکیں۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں عالمگیریت کا بنیادی ہدف پس ماندہ ممالک تھے جن کی معیشتوں کو کچلنے کی بھرپور کوشش کی گئی اور اس معاملے میں کسی بھی سطح پر شرمندگی کا اظہار تک نہیں کیا گیا۔ ترقی یافتہ دنیا نے اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے خصوصی بین الاقوامی قوانین وضع کئے اور ان قوانین کو بروقت نافذ کرنے پر بھی توجہ دی۔ جو ممالک اپنی معیشتوں کے دفاع کی صلاحیت اور سکت سے محروم تھے، ان کے خلاف بھرپور اقدامات کئے گئے اور مختلف بین الاقوامی اداروں کے ذریعہ ان کی گردن میں، عالمگیریت کے نام پر، غلامی کا پھندا ڈال دیا گیا۔ ترقی یافتہ دنیا نے صنعتی عمل تیز کیا جس کے نتیجہ میں ماحول کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ اس نقصان کے ازالے کی کوئی بھی بامقصد اور ٹھوس کوشش اب تک نہیں کی گئی۔

بل کلنٹن کا خاموش معاشی قتل کا زمانہ گزرا اور جارج واکر بش کا دور آیا جس میں ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کو اقتصادی ہی نہیں، جغرافیائی طور پر بھی ذبح کرنے کی کوشش کی گئی۔ بش انتظامیہ نے جو کچھ کیا اس کے نتیجہ میں پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے ساتھ ساتھ خود ترقی یافتہ دنیا کے لئے بھی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ صورتحال ایک ایسی دنیا کو جنم دے رہی ہے جس میں لوگ ہر وقت دہشت زدہ ہی رہیں گے۔

●●

دعوت

پرنٹر، پبلشر خلیل احمد نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے ایانین آرٹ پرنٹرز قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں برائے دعوت آفسیٹ پرنٹرز چھپوا کر دفتر ''دعوت'' ڈی ۳۱۴، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

ایڈیٹر: پرواز رحمانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: شفیق الرحمٰن

سب ایڈیٹرس: محمد صبغۃ اللہ ندوی، عقیدت اللہ قاسمی، عمیر کوثی ندوی، اشرف علی بستوی

دماغین برین ٹانک

(۱) دماغین ہر عمر کے ذہنی وجسمانی طور سے مصروف لوگوں کے لئے مددگار ہے

dimagheen

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

طاقت سے بھرپور صحت بخش ٹانک

شربت اکسیر

جسمانی کمزوری دُور کرنے میں بے مثال

ایس اے بی بخشی کمپنی

۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کولوٹولہ) کولکاتا-۷۳

Phones: 033-22373039, 033-22377646

دہلی اسٹاکسٹ: ☆ جگمگ اسٹور نیو ورائٹی اسٹور، لال کنواں (نزد ہمدرد) دہلی

تصنیفی تربیت کورس

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ اپنے زمانہ قیام ہی سے بحث وتحقیق کے ساتھ نوخیز اہل قلم کو اسلامی موضوعات پر تصنیف وتالیف کی تربیت بھی فراہم کرتا ہے۔ اس شعبہ سے فائدہ اٹھا کر بہت سے حضرات آج ملک بیرون ملک میں اہم علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس دوسالہ تربیتی کورس کے لئے انتخاب انٹرویو کی بنیاد پر ہوگا۔ منتخب ہونے والے افراد کو ادارہ کی نئی اور کشادہ عمارت میں قیام کی سہولت کے ساتھ ڈھائی ہزار روپے ماہانہ وظیفہ بھی دیا جائے گا۔ اطمینان بخش کارکردگی کی صورت میں ایک سال کے بعد یہ رقم تین ہزار روپے کی جاسکتی ہے۔

مطلوبہ اہلیت: (۱) درخواست دہندہ کسی کالج یا یونیورسٹی سے ایم اے ہو اور اسلامیات اور عربی کی اچھی استعداد رکھتا ہو۔ (۲) کسی معروف عربی مدرسہ سے فضیلت یا اس کے مساوی سند کا حامل ہو اور ہائی اسکول کے معیار کی انگریزی کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

درخواست کے ساتھ حسب ذیل معلومات فراہم کی جائیں

(۱) نام (۲) عمر (پچیس ۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو) (۳) پورا پتہ (۴) تعلیمی استعداد (اسناد و مارک شیٹ کی نقول کے ساتھ) (۵) کورس کے علاوہ مطالعہ کی تفصیل (۶) مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مضامین کی نقول (۷) دلچسپی کے موضوعات کی تفصیل (۸) تحریک اسلامی سے متعلق یا کسی معروف شخصیت کا تصدیق نامہ۔ جن افراد کو انٹرویو کے لئے بلایا جائے گا انہیں ایک طرف کے سلیپر کلاس کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔ درخواست ۳۱ر مارچ ۲۰۰۹ء تک اس پتے پر بھیجیں۔

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکریٹری)

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

نبی نگر، جمال پور، پوسٹ باکس نمبر ۹۳، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ Mob. 09410060558

ضرورت رشتہ

منصوری برادری سے تعلق رکھنے والی ۲۷ سالہ لڑکی جو انگلش میڈیم سے ایم اے بی ایڈ پاس ہے۔ قد پانچ فٹ تین انچ، رنگ صاف، قبول صورت، صوم صلوٰۃ کی پابند، امور خانہ داری میں ماہر کے لئے رشتہ درکار ہے۔ جس کے والد لکھنؤ بچوالئے میں U.D.A کے پوسٹ پر فائز ہیں۔ تعلیم یافتہ برسرروزگار دینی رجحان کے حامل رشتہ کو ترجیح دی جائے گی۔ برادری وعلاقہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ رابطہ کریں۔ موبائل نمبر:

09935807525, 09451429076

ضرورت رشتہ

ایک دیندار گھرانے کی کانونیٹ کی تعلیم یافتہ لڑکی M.A. Social Work (ایم اے سوشل ورک) (سبھی امتحان فرسٹ ڈویژن پاس) قد پانچ فٹ ایک انچ، رنگ گیہواں، کے لئے تعلیم یافتہ دیندار برسرروزگار لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ دہلی، ممبئی، اعظم گڑھ (یوپی) کا رشتہ مطلوب ہے۔ بھوپال کے رشتہ کو ترجیح دی جائے گی۔

رابطہ قائم کریں:

07552589441

قادری دواخانہ کی کامیاب ترین یونانی دوائیں

DIAL
033-2469-3173
033-2489-3539

گھٹنے کے درد میں؟

زعفرانی تیل

گیسٹک کے درد میں

قبض ٹروجن

بدہضمی، بھوک کی کمی، درد جگر، قبض، سینے کی جلن اور پیٹ کے جملہ امراض میں بہت ہی مفید ہے

Qadri Dawakhana
B-18, NAWAB WAJID ALI SHAH ROAD, KOLKATA - 24,
DISTRIBUTORS: DARYA BADI DAWAKHANA 393, E. R. Road, Pydhonie, Mumbai - 400 003 Ph: 022-2341-1957.
RELAX ENTERPRISES 3416, Bahishti Wada, No.1, Dhule, - 424 001 Ph: 02562-236952

نقوشِ تربیت

تصنیف: الشیخ مصطفیٰ محمد طحان

ترجمہ: مولانا تنویر آفاقی

غاروالوں کا قصہ، جاہل راہب اور عالم کا قصہ، اصحاب اخدود کا قصہ، کتے کو پانی پلانا جنت کی ضمانت بنا، یہ متعفن لاشیں ہیں، غزوہ بدر کے کمانڈر، بغاوت، نفاق اور حب دنیا، دعوتی مشن کا کردار، محبت کے بغیر تربیت ممکن نہیں، حضرت عمرؓ کا عدل وانصاف، خلیفہ وقت کو نصیحت، پاک دامنی کی حفاظت، عیب پوشی، عربی وعجمی اور وہ خاتون جس کی شکایت اللہ نے آسمان میں سنی جیسے درجنوں عناوین کے تحت اسلامی وتاریخی واقعات کی روشنی میں اصلاح وتربیت کا ایک موثر اور قابل عمل مرقع۔۔۔۔ مشہور عرب عالم ومصنف الشیخ مصطفیٰ محمد طحان کی مقبول عام عربی کتاب 'معالم تربویۃ' کا سہل آسان اور عام فہم اردو ترجمہ۔

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ● صفحات: ۲۱۶ ● قیمت: Rs.70/-

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

Post Box. 9752, Jamia Nagar, New Delhi-110 025
Phones:26971652,26954341, Fax:26947858
E-mail: mmipublishers@gmail.com Website: www. mmipublishers.net